آتش کدہ
طاہر جاوید مغل
محمد سجاد بھٹی

آتش کدہ

طاہر جاوید مغل

بظاہر زندگی کی روش آسان نظر آتی ہے... مگر راستے ہمیشہ ہموار نہیں رہتے... ماہ و سال آسانی سے نہیں گزرتے... واقعات کی گردش ہو یا پھر کوئی سانحہ، دل کو ہلا دیتا ہے... یہ درد و غم برف کے مانند پگھلتے نہیں... بلکہ پتھر کی طرح دل پر نقش ہو جاتے ہیں... ایک ایسی ہی داستانِ تحیر... جس کے کردار پیشِ منظر میں رہتے ہوئے بھی پس منظر کا حصہ تھے... انہیں جاننے کے لیے ماضی کے جھرونکوں سے آگاہی ضروری تھی... برف پوش وادیوں میں کھو جانے والے کرداروں کی تلاش کا سلسلہ... اسرار کے پردوں میں چھپی سازشیں جو بلند و بالا قلعے کی دیواروں سے روزن تلاش کررہی تھیں... دو دلوں کے بیچ ہوش مندوں نے ہمیشہ رکاوٹیں کھڑی کی ہیں... مگر جب عشق، جنوں کی سرحدوں میں داخل ہو جائے تو پھر کوئی رکاوٹ... رکاوٹ نہیں رہتی... قدم قدم پر ایک نئے جہاں سے متعارف کراتی سنسنی خیز داستان...

فطرت و جذبات میں قیامت مچا دینے والی تلخیوں کا رقصِ حقیقت

میں دیکھ رہا تھا کہ عمران کچھ دنوں سے بہت اداس ہے۔ اس کی اداسی کی دو وجوہات تھیں۔ ایک تو اُسے چند دنوں بعد وعدے کے مطابق انڈیا واپس چلے جانا تھا۔ دوسرے یہ کہ اگلے ہفتے ماہین کی منگنی ہو رہی تھی اور مجھے اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ چپکے چپکے ماہین کو چاہتا ہے۔ لاف زنی تو وہ بہت زیادہ کرتا تھا۔ مہوش حیات، کترینہ کیف، عالیہ بھٹ اور پتا نہیں کن کن سے اپنے تعلقات جوڑتا تھا مگر اس کی حرکات و کیفیات بتاتی تھیں کہ دلکش ماہین کے لیے واقعی اُس کے دل میں کوئی خفیہ گوشہ بن چکا ہے۔

ایک دن میں نے اس سے کہا۔ ”دیکھو عمران، انڈیا تو تمہیں جانا ہی ہے تو پھر کیوں نہیں ماہین کی منگنی وغیرہ سے پہلے چلے جاتے۔“

”چاچو! آپ خود ہی تو کہتے ہیں کہ ہم جتنی زیادہ تکلیفیں سہنا اور دکھ جھیلنا سیکھتے ہیں، اتنے ہی مضبوط ہوتے ہیں اور ہمارے لیے خوشیوں کی راہیں ہموار ہوتی ہیں۔“

”پچھلے دنوں کافی دکھ جھیلے ہیں تم نے۔ اب خوشیوں کی راہ ہموار ہو رہی ہے نا، تم اپنے وطن واپس جا رہے ہو؟“

وہ ایک دم ہتھے سے اکھڑ گیا۔ ”چاچو! دیکھیں اب آپ غلط بات کہہ

رہے ہیں۔ میرا وطن انڈیا نہیں، یہ پاکستان ہے۔ میرے والد یہاں کے تھے، میری والدہ کے آباؤاجداد بھی یہیں کے تھے۔ ان کی نس نس میں پاکستان رچا بسا ہوا تھا۔ میں تو بس پیدا ہونے کے لیے غلطی سے انڈیا چلا گیا تھا۔"

"چلو جو بھی ہے، تمہارا اب سب کچھ انڈیا میں ہے۔"

"لیکن بہت کچھ یہاں بھی تو ہے۔ مہوش حیات، کجل علی، اقرا عزیز وغیرہ لڑ لڑ کر ہلکان ہو رہی ہیں میرے لیے۔ اور پھر یہ، معاشرے کی پابندیوں اور بے رحم زنجیروں میں جکڑی ہوئی، وہ بے بس روح۔ میں اس کی منگنی کا سارا غم اپنے سینے میں اتار کر انڈیا جانا چاہتا ہوں۔ بقول مشہور فلاسفر انوکی پہلوان، غم بھی تو سفرِ حیات میں زادِ راہ کی طرح ہوتے ہیں۔"

مجھے پتا تھا کہ میں کچھ بھی کہوں، وہ منگنی تک یہیں رہے گا...... اور واقعی وہ رہا۔

جیسا کہ میں اب تک اندازہ لگا چکا تھا۔ ماہین کے ہونے والے شوہر حسام کو خودنمائی کا شوق کچھ زیادہ ہی تھا۔ اس کے والد صاحب بھی اپنی امارت اور وسیع تعلقات کے اظہار میں اس سے پیچھے نہیں تھے۔ انگیج منٹ کا وہ فنکشن لاہور کے اعلیٰ ترین ہوٹل میں رکھا گیا تھا۔ وہ دسمبر کی ایک یخ بستہ رات تھی۔ گرما گرم وسیع ہال رنگوں اور روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ یہ منگنی کی نہیں بلکہ کسی ٹھیک ٹھاک شادی کی تقریب نظر آ رہی تھی۔ پانچ سو کے قریب مہمان ہوں گے۔ وہ سب کے سب بڑی بڑی گاڑیوں سے اتر کر اندر پہنچے تھے۔ منگنی کے قیمتی لباس میں وہ نہایت دلکش نظر آتی تھی۔ اردگرد کی ہر شے جیسے اس کے گال کے حسین ڈمپل کی طرف کھنچتی اور اس میں ڈوبتی محسوس ہوتی تھی۔ عمران اسے دیکھ کر مسلسل ٹھنڈی آہیں بھر رہا تھا۔ اب پتا نہیں، یہ واقعی ٹھنڈی آہیں تھیں یا اس میں اداکاری بھی شامل تھی۔ ماہین کی بڑی بہن شاہین کو خصوصی طور پر انگلینڈ سے اس تقریب میں شرکت کے لیے آنا تھا مگر بوجوہ نہیں آسکی تھی۔

عالی شان ڈنر کے بعد تقریب بڑے اچھے طریقے سے اختتام کی طرف بڑھ رہی تھی۔ جب اسٹیج پر تصویریں وغیرہ اتاری جانے لگیں۔ ماہین کی خصوصی فرمائش پر مجھے اور عمران کو بھی اسٹیج پر بلایا گیا۔ حسام اسٹیج سے نیچے اپنے دوستوں سے باتیں کر رہا تھا۔ میں اور عمران، ماہین کے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ عمران اب خوش نظر آنے کی بھرپور کوشش کر رہا تھا۔ ماہین میری طرف جھک کر سرگوشی میں بولی۔

"دیکھیں انکل! میرا منگیتر ہینڈسم لگ رہا ہے نا؟"

میں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا۔ پھر اس نے غالباً یہی سرگوشی عمران کے کان میں بھی کی۔ میں نے حسام کو دیکھا۔ ماہین کو یوں عمران کی طرف جھکتے اور اس کے کان میں بولتے دیکھ کر حسام کی مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ اسے اپنے اور ماہین کے اردگرد عمران کی موجودگی اچھی نہیں لگتی تھی۔ ہم اسٹیج پر سے اٹھنے ہی والے تھے جب ماہین نے پھر سرگوشی کی۔

"دیکھیں انکل، آپ مارشل آرٹ کے حوالے سے اب بھی کتنے پاپولر ہیں۔ محفل میں بہت سے لوگ آپ ہی کی طرف دیکھ رہے ہیں۔"

عمران فوراً معنی خیز لہجے میں بولا۔ "بہت سے لوگ آپ کی طرف بھی تو دیکھ رہے ہیں۔" پھر جلدی سے بات بدلی۔ "آپ بھی تو ایک مارشل آرٹسٹ ہیں۔"

"اس حوالے سے مجھے کوئی نہیں پہچانتا۔" وہ مسکرائی۔

عمران نے پوچھا۔ "ویسے ماہین، اگر شادی کے بعد آپ میں اور حسام میں خدانشاستا جھگڑا ہو جائے تو آپ اپنا فن استعمال کریں گی؟"

وہ ہنسنے لگی۔ "خدانشاستا؟ یہ کیا ہوتا ہے؟"

"خدا تو خدا ہوتا ہے اور نشاستا وہی جو مٹھائیوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔"

وہ ہنس ہنس کر دہری ہونے لگی اور عمران کے کندھے پر ہاتھ مارا۔ "اس کو خدانخواستہ کہتے ہیں۔" وہ بولی۔

میں نے کن انکھیوں سے دیکھا۔ ماہین کو یوں بے تکلفی سے ہنستے اور عمران کے کندھے پر ہاتھ مارتے دیکھ کر حسام کا چہرہ سرخ ہوگیا۔ وہ گھوما اور ہمارے سامنے سے گزر کر پاؤں پٹختا ہوا باہر چلا گیا۔ ماہین کی ایک عزیزہ نے اسے آواز بھی دی لیکن وہ سنی اَن سنی کر گیا۔ اس کے انداز نے اسٹیج پر موجود کئی لوگوں کو چونکایا اور ساتھ ہی ماہین کو بھی۔ میں نے دیکھا، ماہین کے چہرے پر رنگ سا آ کر گزر گیا تھا۔

☆☆☆

دو دن بعد ماہین میری کوٹھی پر آئی تو خلافِ معمول کچھ چپ چپ تھی۔ میں نے منگنی کے روز والی بات دہرانا مناسب نہیں سمجھا۔ رسمی گفتگو کے بعد وہ بولی۔ "انکل، عمران انڈیا کب جا رہا ہے؟"

"میرے خیال میں تیاری میں ہے۔ دو تین ہفتوں میں چلا جائے گا...... مگر تم کیوں پوچھ رہی ہو؟"

"بس یونہی...... پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ حسام خواہ مخواہ اس سے خار کھانے لگا ہے۔ شاید ایک دو الٹی سیدھی باتیں عمران سے بھی ہوئی ہیں جن کا حسام نے برا منایا ہے۔"

”چلو جو بھی ہے۔ اب اُسے چلے ہی جانا ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ آہ سی بھر کر بولی۔ ”ویسے انکل! عمران اپنی طرز کا مختلف بندہ ہے۔ اس میں بے پناہ صلاحیتیں ہیں۔ میرا دل چاہتا تھا کہ وہ یہیں رہے۔ آپ کے ساتھ۔ آپ کے زیرِسایہ...... لیکن اب میں بھی سوچتی ہوں، شاید اس کا جانا ہی بہتر ہے۔“

”یہ بات تم حسام کی وجہ سے کہہ رہی ہو؟“

ایک دم اُس کی آنکھوں میں نمی سی آگئی۔ ”انکل! حقیقت یہ ہے کہ میں حسام سے بہت محبت کرتی ہوں۔ اس کی جدائی یا ناراضگی برداشت نہیں کرسکتی۔ وہ کچھ غصے والا ضرور ہے لیکن ہمارا طویل ساتھ رہا ہے۔ انگیج منٹ والی رات جو بات ہوئی، اس کے بعد میں نے حسام کو بڑی مشکل سے منایا ہے۔ وہ جلدی روٹھتا نہیں لیکن روٹھ جائے تو ایک دم ضدی ہوجاتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ حساس بھی ہے۔“

”تھوڑا بہت حساس یا ضدی ہونا بُری بات نہیں لیکن اس میں جو خودنمائی اور غصے کی عادتیں ہیں، ان پر اسے کنٹرول کرنا چاہیے۔“

اس سے پہلے کہ ماہین جواب میں کچھ کہتی، اس کے موبائل پر کال کے سگنل آئے۔ اسکرین دیکھ کر اس نے جلدی سے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو...... ہیلو آنٹی، کیا بات ہے؟“

جواب میں جو کچھ کہا گیا اس نے نہ صرف ماہین کا موڈ ایک دم بدل دیا بلکہ مجھے اس کے جسم میں ہلکی سی لرزش بھی محسوس ہونے لگی۔ اس کے سرخ و سپید رنگ میں ایک طرح کی زردی گھل گئی تھی۔

کال ختم کر کے وہ بولی۔ ”انکل تابی! ایک مسئلہ ہوگیا ہے...... پلیز پلیز، آپ کو میرے ساتھ چلنا ہوگا...... میرے گھر تک۔“

”مگر بات کیا ہے ماہین؟“

”میں آپ سے اس بارے میں بات کرنے ہی والی تھی کہ یہ کال آگئی...... یہ آنٹی راحت ہیں کئی دنوں سے بڑی پریشان تھیں۔ آج اس پریشانی کا نتیجہ نکل آیا ہے۔ کوئی اُن کے بیٹے کو زبردستی اپنے ساتھ لے گیا ہے۔ آپ آئیں میرے ساتھ میں راستے میں آپ کو سب بتاتی ہوں۔“ ماہین کی پریشانی دیکھ کر مجھے اٹھنا ہی پڑا۔

چند منٹ بعد میں ماہین کے ساتھ اس کی گاڑی میں کینال پارک کی طرف جارہا تھا۔ اس نے راستے میں مجھے بتایا کہ آنٹی راحت اس نوجوان ملازمہ ”رانو“ کی خالہ کا نام ہے جو اس کے گھر کام کرتی ہے۔ اس کا بیٹا کہیں لاہور سے باہر ملازمت کرتا تھا۔ آج کل وہ گھر واپس آیا ہوا تھا اور بہت بیمار اور پریشان تھا۔ آنٹی راحت کو لگتا تھا کہ وہ کوئی بڑا دکھ دل میں چھپائے ہوئے ہے...... لیکن بتاتا کچھ نہیں۔ اور آج کوئی عورت اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گئی ہے۔“

ہم نچلے درجے کی ایک گنجان آبادی میں پہنچے اور ڈھائی تین مرلے کے ایک گھر میں داخل ہوئے۔ جسے آنٹی راحت کہہ رہی تھی وہ اپنے بیٹے اور ایک پوتی کے ساتھ یہیں رہتی تھی۔ خاوند عرصہ پہلے فوت ہوگیا تھا۔ بیٹے کی بیوی بھی وفات پاچکی تھی۔ بیٹے کی چھ سالہ بچی کو آنٹی راحت ہی پال رہی تھی۔

میں اور ماہین اندر پہنچے تو پینتالیس پچاس سالہ راحت اپنی پوتی نایاب کا سر گود میں لیے اسے تھپک رہی تھی۔ معصوم بچی کے رخساروں پر خشک آنسوؤں کی لکیریں تھیں۔ کچھ یہی کیفیت نیم سفید سر والی راحت کی بھی تھی۔ اس گھر کی حالت بستی کے دیگر گھروں سے قدرے بہتر نظر آتی تھی۔

ماہین کو دیکھ کر عورت پھر زاروقطار رونے لگی۔ ماہین آگے بڑھ کے اس کے گلے سے لگ گئی۔ ”وہ لے گئی میرے فواد کو۔ مجھے پکا پتا ہے وہ زبردستی لے کر گئی ہے۔ وہ نہیں جانا چاہتا تھا۔“

”آنٹی، پتا تو چلے کون لے گئی ہے؟“

”مجھے کچھ خبر نہیں۔ وہ بڑی گاڑی میں آئی تھی۔ ساتھ دو ہٹے کٹے بندے بھی تھے۔ وہ تینوں چار پانچ گھنٹے ہمارے گھر میں رہے ہیں مگر ہمیں باہر نہیں نکلنے دیا اور نہ کسی سے بات کرنے دی ہے۔ وہ عورت میرے پُتر کو لے کر کمرے میں گھسی رہی۔ پتا نہیں اس سے کیا منواتی رہی۔ پھر وہ چپ چاپ اُن کے ساتھ چلا گیا۔ میرا کلیجا نکل رہا ہے بیٹی، مجھے لگتا ہے اب وہ آسانی سے واپس نہیں آئے گا۔“

بچی نے پھر رونا شروع کردیا۔ لگتا تھا کہ وہ اپنے والد سے کافی اٹیچ ہے۔ اس کا کومل جسم بھی تپ رہا تھا۔

اگلے آدھ گھنٹے میں مجھے اس گھرانے کی جو کہانی معلوم ہوئی، وہ مختصراً یوں تھی۔ راحت کے جواں سال بیٹے کا نام فواد تھا۔ پانچ سال پہلے بیوی کے مرنے کے بعد اس نے دوسری شادی نہیں کی۔ فواد یہاں اسکول ویگن چلاتا تھا۔ بہت مشکل سے گزر بسر ہوتی تھی مگر کوئی دو سال پہلے بالکل اچانک اسے ایبٹ آباد کی طرف کوئی بڑی اچھی نوکری مل گئی۔ مسئلہ صرف یہ تھا کہ اسے اکیلے وہیں پر رہنا تھا۔ وہ ڈیڑھ دو مہینے بعد ہی گھر کا چکر لگا پاتا تھا۔ شروع شروع میں

اس کی کم سن بیٹی نے اس کی غیر حاضری کو بہت محسوس کیا مگر پھر کچھ سنبھل گئی۔ یہ کوئی ایک مہینا پہلے کی بات ہے، فواد ڈھائی تین ماہ بعد گھر آیا تو اس کا حلیہ بہت بدلا ہوا تھا۔ سرخ و سپید اور توانا فواد کی جگہ ایک کملایا ہوا سا کمزور فواد، دادی پوتی کے سامنے تھا۔ آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے، بال بکھرے ہوئے۔ وہ سگریٹ پر سگریٹ پھونک رہا تھا۔

راحت نے بیٹے سے بہت پوچھا کہ اس کے ساتھ کیا مسئلہ ہے مگر اس نے لاکھ کوشش کے باوجود کچھ بتا کر نہیں دیا۔ کوئی گہرا غم اس نے سینے میں چھپا رکھا تھا اور تو اور کسی وقت وہ اپنی لاڈلی بیٹی نایاب کو بھی جھڑک دیتا تھا...... بعد میں خود ہی اسے اپنے ساتھ لپٹا کر پیار کرتا...... اسے مناتا......اور آج ایک اور بڑا صدمہ دادی پوتی پر ٹوٹا تھا۔

تفصیل بتاتے ہوئے اشک بار راحت نے کہا۔ ”وہ کوئی پینتالیس پچاس سال کی عورت تھی۔ بہت صحت منداور بالکل سرخ رنگ والی۔ لگتا تھا کہ غیر علاقے سے آئی ہے۔ اس کے ساتھ جو دو بندے تھے وہ بھی کہیں باہر ہی کے تھے۔ عجیب سی زبان بولتے تھے۔ اس عورت کو دیکھ کر میرا پُتر ایک دم ڈر سا گیا تھا۔“ راحت سسکیاں لینے لگی۔

ماہین نے اس کا شانہ تھپکا۔ ”آنٹی راحت، آپ بالکل پریشان نہ ہوں۔ بس ہمیں پورا واقعہ ذرا تفصیل سے بتائیں۔ یہ میرے انکل پولیس میں ہیں۔ اللہ نے چاہا تو ہم بڑی جلدی اس عورت اور اس کے دونوں غنڈوں کو ڈھونڈ لیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”بہن جی، میں نے کال بھی چلوا دی ہے۔ ناکوں پر چیکنگ وغیرہ ہوگی۔ آپ تسلی رکھیں۔“

راحت نے روتے ہوئے بتایا۔ ”فواد اس عورت کو بیگم صاحبہ کہہ کر بلا رہا تھا۔ وہ اسے کمرے میں لے گئی۔ کبھی بڑی سخت اور کبھی نرم آواز میں بولتی رہی۔ اس کی بس ایک دو باتیں ہی میرے کانوں میں پڑیں۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”بس میں چاہتی ہوں کہ تم میری نظروں کے سامنے رہو۔“ پھر اس نے یہ بھی کہا۔ ”بس تم یہ سمجھو فواد! کہ تم نے جو کچھ دیکھا، وہ ایک دھوکا تھا۔ وہ کبھی تھی ہی نہیں۔“

راحت سسکی۔ ”پتا نہیں، وہ کس کی بات کر رہی تھی۔ اللہ جانے وہاں میرے بیٹے کے ساتھ کیا ہوا ہے جو وہ اس طرح مہینوں کا بیمار نظر آتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”بہن جی! آپ یہ بتاؤ کہ ایبٹ آباد میں اس کا کیا اتا پتا تھا۔ کچھ تھوڑا بہت تو بتایا ہوگا اس نے؟“

”نہیں اس نے کبھی کچھ نہیں بتایا۔ میں تو یہ بھی یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ ایبٹ آباد ہی جاتا تھا یا کسی اور شہر میں۔“

ماہین نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ”اور پھر جس طرح اچانک اسے بڑی اچھی نوکری مل گئی اور گھر میں پیسے آنے لگے، یہ بھی سوچنے والی بات ہے۔“

بچی نایاب کو کئی ہفتوں سے ٹائیفائیڈ بھی تھا۔ ہم قریباً ایک گھنٹا قابلِ رحم راحت اور اس کی خوب صورت پوتی کے ساتھ رہے، پھر ضروری معلومات حاصل کرنے کے بعد واپس آگئے۔

☆☆☆

دس دن گزر چکے تھے۔ فواد کا کچھ پتا نہیں چلا تھا، نہ ہی اُس کی طرف سے کوئی خیر خبر موصول ہوئی تھی۔ فواد کے ایک دو عزیز ایبٹ آباد کا چکر بھی لگا آئے تھے مگر کچھ حاصل وصول نہیں ہوا تھا۔ رو، رو کر راحت کا بُرا حال تھا اور فواد کی کم سن بیٹی تو پہلے ہی کملائی ہوئی کلی نظر آتی تھی۔ وہ اپنے والد کو بُری طرح ”مِس“ کر رہی تھی۔

اس روز میں اپنے پرانے دوست جگت سنگھ کی طرف جانے کے لیے نکل ہی رہا تھا کہ ماہین اپنی سوزوکی کار پر آدھمکی۔ ایک ”یوٹیوبر“ کی حیثیت سے وہ بڑی متحرک تھی۔ آج پُرجوش بھی نظر آ رہی تھی۔ گہری سنجیدگی کے ساتھ بولی۔ ”انکل! میں نے جانے کا پکا پکا پروگرام بنالیا ہے۔ آپ کو بھی ساتھ لے جانا چاہتی ہوں۔ آپ نہیں جائیں گے تو پھر اکیلی چلی جاؤں گی۔“

”ایسی کیا مصیبت آن پڑی ہے؟“

”مصیبت مجھ پر نہیں انکل، بے چاری آنٹی راحت پر اور اس معصوم بچی پر آئی ہوئی ہے۔ مجھے فواد کے بارے میں ایک کھوج ملا ہے۔ شاید یہ بات درست ہی ہے کہ وہ ایبٹ آباد کی طرف ہی موجود ہے۔“

”کھوج کیا ہے؟“

اس نے جھٹ اپنی پینٹ کی بیک پاکٹ میں سے اپنا اسمارٹ فون نکالا اور مجھے تین تصویریں دکھائیں۔ یہ فواد کی ہی تصویریں تھیں۔ وہ کسی پہاڑی مقام پر کھڑا تھا۔ دو تصویروں میں تو دھند تھی لیکن ایک کافی واضح تھی۔ ماہین نے کہا۔ ”جب شروع، شروع میں فواد اپنی نئی ملازمت پر لاہور سے باہر گیا تو نایاب اسے بے طرح یاد کرتی تھی۔ اس کے دل بہلاوے کے لیے ہی فواد نے یہ تصویریں اپنے موبائل سے والدہ کے موبائل پر منتقل کی تھیں۔“ پھر ماہین صاف تصویر کو انلارج کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ دیکھیں، پورے

یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ تصویر ایبٹ آباد اور مانسہرے سے کچھ آگے شوگراں کی ہے۔ غور کریں یہ سڑک، یہ پہاڑیاں اور گھروں کے اسٹائل وغیرہ۔''

مجھے بھی یہی لگا کہ یہ شوگراں کا ال اسٹیشن ہے...... اگر فواد واقعی شوگراں میں کہیں ملازمت کرتا تھا تو پھر اسے ڈھونڈنا مشکل نہیں تھا۔ وہ ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ کوئی بھی شخص ایک دو دن میں اسے کھنگال سکتا ہے (تصویر میں فواد قبول صورت اور دراز قد نظر آتا تھا)

میں نے بغور ماہین کی طرف دیکھا اور سمجھ گیا کہ وہ شوگراں جانے سے ہرگز باز نہیں آئے گی۔ مجھے بھی آفس سے تین چار روز کی چھٹی تھی۔ نجانے دل میں کیا آئی کہ میں نے ماہین کے ساتھ جانے اور اس معاملے کو دیکھنے کی ہامی بھر لی۔ وہ خوش نظر آنے لگی۔ پھر ایک دم سنجیدہ ہو کر بولی۔ ''لیکن انکل پلیز! عمران کو اس بارے میں پتا نہ چلے کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی ساتھ چلنے کو تیار ہو جائے۔ ایسے میں، میں نہیں جاسکوں گی۔ حسّام بہت ''چِڑی'' ہو چکا ہے عمران کے حوالے سے۔''

''نہیں اس کے جانے کا کوئی امکان نہیں۔ سنا ہے وہ واپس جانے کی تیاری میں ہے۔ ویسے بھی اس کی زیادہ تر انسان دوستی اسی علاقے تک محدود تھی جہاں وہ رہ رہا تھا اور اس کے والد رہا کرتے تھے۔''

''کاش ہم عمران کو سمجھ سکتے اور وہ بھی ہمیں سمجھ سکتا۔'' ماہین نے افسردگی سے کہا۔ ''انکل! میری دلی خواہش ہے کہ وہ زندگی میں آگے بڑھے، ترقی کرے، میں اس کے لیے بہت گڈ وشز رکھتی ہوں۔''

ماہین کے ساتھ آدھ پون گھنٹا مزید نشست رہی۔ کافی باتیں ہوئیں اور شوگراں جانے کا پروگرام بھی طے ہو گیا۔ اپنے دوست کی طرف جانے کا میرا پلان دھرا رہ گیا تھا، ماہین کی خواہش پر ہم ''گھریلو جم'' میں چلے گئے جہاں وہ حسبِ معمول مجھ سے لڑائی بھڑائی کے داؤ پیچ سیکھتی رہی۔ جب ہم ''جم'' میں تھے...... پتا نہیں کیوں مجھے ایسا لگا کہ ایک سایہ سا کھڑکی کے سامنے سے گزر کر باغیچے کی طرف گیا ہے۔ ملازمہ کرن تو کچن میں تھی۔ شاید مجھے وہم ہوا تھا۔

☆☆☆

ماہین اپنے منگیتر حسّام کو بھی ساتھ لے جانا چاہتی تھی مگر وہ اپنے ڈیڈ کے ساتھ ایک بزنس ڈیل کے لیے کراچی جا رہا تھا۔ تاہم اُس نے ماہین کو میرے ساتھ شوگراں جانے کی اجازت دے دی۔ ہم دونوں علی الصباح پانچ بجے گلگشت پر لاہور سے نکلے اور موٹروے سے دس بجے کے قریب اسلام آباد پہنچ گئے۔ مانسہرہ پہنچنے میں چار پانچ گھنٹے مزید لگ گئے۔ آگے شوگراں کی چوٹی کی طرف بہت زیادہ چڑھائی تھی مگر کسی نہ کسی طرح میں اپنی گلگشت کو اوپر پہنچانے میں کامیاب رہا۔ جب ہم مطلوبہ ہوٹل کے سامنے گاڑی سے اتر رہے تھے جس شخص نے سب سے پہلے ہمارا استقبال کیا، وہ اپنی طرز کا انوکھا بندہ تھا...... وہ عمران تھا۔ اس نے اپنی چمکیلی بتیسی کی پوری نمائش کرنے کے بعد اپنے دونوں ہاتھ میری طرف بڑھائے اور پکارا۔ ''واہ جی واہ...... یہ کیا چمتکار ہو گیا۔ آپ بھی میرے پیچھے پیچھے ہی یہاں پہنچ گئے۔ مجھے تو اپنی نگاہوں پر بھروسا نہیں ہو رہا۔''

ماہین یک دم چپ ہو گئی۔ میں نے بھی حیرت کے ریلے سے گزرنے کے بعد اسے کڑی نظروں سے گھورا۔ ''اس کا کیا مطلب ہے؟''

جواب دینے کے بجائے اس نے زبردستی اپنی چھاتی میری چھاتی سے ملائی اور چہکا۔ ''مطلب تو آپ کو بتانا چاہیے نا۔ میں تو انڈیا جانے سے پہلے ایک دفعہ یہاں کے شمالی علاقہ جات دیکھنا چاہ رہا تھا۔ طوفانی دورے پر کل صبح ہی یہاں پہنچا ہوں۔ میرا دوست ضیا بھی ساتھ آنا چاہ رہا تھا لیکن چاچو جانی، بقول ابن انشاء اور ابن بطوطہ جو مزہ اکیلے گھومنے میں ہے، وہ ساتھیوں کے ہمراہ نہیں۔ بائی دی وے ان دونوں بھائیوں میں سے بڑا کون سا تھا۔ عینک سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ابن انشاء بڑے تھے۔''

ماہین نے مجھے شک کی نظروں سے دیکھا لیکن میرے تو اپنے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ میں نے اس سفر کا ذکر اپنے سوا کسی سے نہیں کیا تھا۔ پھر یہ افلاطون یہاں کیسے آٹپکا تھا؟

''تم سو فیصد جھوٹ بول رہے ہو عمران۔ تم اتفاقیہ یہاں نہیں ہو سکتے۔'' میں نے کہا۔

''اگر میں اتفاقیہ انڈیا میں پیدا ہو سکتا ہوں تو یہاں کیوں نہیں ہو سکتا؟''

ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ مجھے تین روز پہلے کی وہ بات یاد آ گئی جب میں اپنے گھر میں ماہین کے ساتھ ''ہوم جم'' میں تھا اور مجھے لگا تھا کہ کوئی آس پاس موجود ہے۔ (میری اور ماہین کی اس ملاقات میں ہم نے گمشدہ فواد کے بارے میں تفصیلی بات کی تھی اور یہ شوگراں والا پروگرام بھی بنایا تھا) بات سمجھ میں آنے لگی۔ عمران اس وقت مجھ سے ملنے آیا تھا اور اس نے کسی طرح چھپ کر میری گفتگو سن لی

تھی۔ مجھے بڑا تاؤ آیا مگر میں ماہین کے سامنے اسے بُرا بھلا کہنا نہیں چاہتا تھا۔ دوسری طرف وہ اس بات پر ڈٹا ہوا تھا کہ یہ سب کچھ اتفاقیہ ہوا ہے۔ ”کہاں ٹھہرے ہوئے ہو؟“ میں نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔

اس نے ایک قریبی ہوٹل کا نام لیا اور بولا کہ اگر ہم کو بُرا لگا ہے تو وہ یہاں موجود ہوتے ہوئے بھی دوبارہ ہم سے ملنے نہیں آئے گا۔

اس نے گاڑی سے سامان اتارنے میں ہماری مدد کی اور اسے ہوٹل کے استقبالیہ تک بھی پہنچایا۔ ماہین نے ایک دو رسمی کلمات کے سوا اس سے کوئی بات نہیں کی۔ وہ اپنے ہوٹل واپس جانے کے لیے مڑا اور پھر جاتے جاتے رک گیا۔ ”پلیز چاچو، میری ایک چھوٹی سی بات سن لیجیے۔“

میں چند قدم چل کر اُس کے پاس پہنچا۔ وہ رازداری کے انداز میں گویا ہوا۔ ”چاچو! آپ جن لوگوں کو ڈھونڈنے یہاں آئے ہیں وہ آپ کو یہاں نہیں ملیں گے۔“

”کیا مطلب؟“

وہ اپنی جیکٹ کے کالر درست کرتے ہوئے بولا۔ ”چاچو! آپ کے اس نالائق بھتیجے کو کشف وغیرہ بھی تو ہوتے ہیں۔ میرا علم مجھے بتا رہا ہے کہ آپ یہاں شوگراں میں اُس موٹی عورت اور اس کے دو کارندوں کو ڈھونڈیں گے جو فواد کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔ ان کی اسکائی بلیو بیڈفورڈ کو بھی آپ یہاں تلاش کریں گے مگر یہ دونوں چیزیں آپ کو یہاں نہیں ملیں گی۔ میں آپ کے آنے سے پہلے ہی بہت سر کھپائی کر چکا ہوں۔“

میں ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔ ”اور اس کے باوجود تم کہتے ہو کہ تم یہاں اتفاقیہ موجود ہو؟“

”بس جی، میڈیا والوں کے سامنے سیاسی بیان بھی تو دینے پڑتے ہیں۔“

”میڈیا والے کون؟“

”جناب! یہی آپ کی ماہین، سوشل میڈیا کی بندی ہے۔“

”کسی کے گھر میں بلا اطلاع آنا اور چھپ کر باتیں سننا اخلاقی اور قانونی جرم ہے۔“

”چاچو! میں آپ کو پھر بتا رہا ہوں، یہ سب کشف کی باتیں ہیں۔“

”تو پھر یہ کشف بھی تم کو ہو جانا چاہیے کہ ماہین کو یہاں تمہاری موجودگی اچھی نہیں لگی۔ اس کے دل میں تمہاری جو عزت ہے، تم اسے خود برباد کر رہے ہو۔“

”اپنی عزت بچانے کے لیے میں ماہین کو کسی مصیبت میں نہیں ڈال سکتا۔ پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ وہ کسی خطرے میں پڑنے والی ہے اور ویسے چاچو! میں کوئی ایسا عزت بیگ بھی نہیں ہوں۔“

اس کے جانے کے بعد میں نے ماہین کو بتایا کہ وہ کیوں اور کیسے یہاں پہنچ پایا ہے۔ وہ جزبز نظر آرہی تھی مگر اگلے روز منظرنامہ بالکل بدل گیا۔

میں اور ماہین علی الصباح ہوٹل کے چھوٹے سے سرسبز لان میں بیٹھے موبائل فون پر وہ تصویریں دیکھ رہے تھے جن میں لاپتا فواد کسی پہاڑی مقام پر کھڑا نظر آتا تھا۔ اتنے میں عمران بھی آدھمکا۔ وہ ایک طرح سے بن بلایا مہمان تھا مگر اسے ہر طرح کے ماحول میں اپنی جگہ بنانا آتا تھا۔ وہ خود کو ہم میں شامل کر کے کر بیٹھ گیا اور تصویریں دیکھنے لگا۔ دو تصویریں دھندلی مگر ایک واضح تھی۔ تاحال ہم نے دھندلی تصویروں پر زیادہ توجہ نہیں دی تھی۔ لیکن اب میں انہیں بھی دیکھ رہا تھا۔ عمران بھی دیکھنے لگا۔ اچانک وہ چونکا۔ اس نے میرے ہاتھ سے موبائل لیا اور اسے دیکھتا ہوا برآمدے کی طرف چلا گیا۔ برآمدے کی نیم تاریکی میں جا کر اس نے مجھے پکارا۔

”چاچو! ایک سیکنڈ کے لیے اِدھر آئیں۔“

میں وہاں پہنچا تو وہ دھندلی تصویر کو نیم تاریکی میں ”انلارج“ کر کے دیکھ رہا تھا۔ اس نے موبائل کی اسکرین میرے سامنے کی۔ ”چاچو جی! ذرا غور سے دیکھیں۔“

میں نے اسکرین پر نگاہ جمائی اور چند سیکنڈ بعد مجھے بھی چونکنا پڑا اس دھندلی تصویر میں بادلوں کے ساتھ ایک برفانی چوٹی کی جھلک بھی نظر آتی تھی۔ میں نے چونکہ کافی عرصہ ان برف پوش پہاڑوں میں گزارا تھا لہٰذا یہاں کے اکثر خدوخال پہچانتا تھا۔ اس چوٹی کی ساخت دیکھ کر مجھے فوراً اندازہ ہوا کہ یہ کے ٹو کی نواحی چوٹیوں میں سے ایک چوٹی ”ماشر بروم“ ہے۔

میں نے عمران کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہاں بھی تحیّر کے آثار تھے۔ صاف پتا چلتا تھا کہ وہ بھی اس معروف پہاڑ کو پہچانتا ہے۔ پاکستان کے شمالی علاقہ جات میں اس کی دلچسپی بہت تھی، وہ بولا۔ ”چاچو! مجھے پچانوے فیصد یقین ہے کہ یہ ماشر بروم ہے۔ اسے شاید ”K1“ بھی کہا جاتا ہے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”اس کا کیا مطلب ہوا؟“

عمران نے سوالیہ نظروں سے میری جانب دیکھا۔

میں نے پُرسوچ لہجے میں کہا۔ ”فواد کا کہنا تھا کہ وہ اس

جگہ پر کام کرتا ہے مگر یہ جگہ تو یہاں سے بہت دور ہے۔ اسکردو کی طرف۔ بلکہ اسکردو سے بھی آگے پانچ چھ گھنٹے کا سفر ہوگا۔“

”مطلب یہ کہ فواد نے اپنی ماں اور بیٹی سے جھوٹ بول رکھا تھا کہ وہ ایبٹ آباد میں ملازمت کرتا ہے؟“

”لگ تو یہی رہا ہے لیکن...... ایک امکان یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ اس تصویر والے علاقے میں کہیں سیر کرنے گیا ہو؟“

”مگر چاچو، اس کے جسم پر جو کپڑے نظر آرہے ہیں، وہ سیر و تفریح والے نہیں ہیں۔ یہ دیکھیں اس کے ہاتھ بھی کالے ہیں اور قمیص پر چکنائی لگی ہوئی ہے جیسے کچن میں کھانا وغیرہ پکاتا رہا ہو یا گاڑی ٹھیک کرتا رہا ہو؟“

ہمارا تجسس اور ہماری حیرت دیکھ کر ماہین بھی ہمارے پاس آن کھڑی ہوئی تھی اور عمران کی نکتہ آفرینی سن رہی تھی۔ یہ سب کچھ انکشاف انگیز تھا۔ جیسا کہ عمران پورے یقین کے ساتھ مجھے اس بات سے آگاہ کر چکا تھا کہ یہاں شوگراں میں اس دبنگ عورت کا کوئی سراغ نہیں جو لاہور سے فواد کو اپنے ساتھ لے کر گئی تھی اور نہ ہی آسمانی رنگ کی وہ بیڈ فورڈ جیپ یہاں پائی جاتی ہے جس پر وہ عورت آئی تھی۔ اب یہ تصویر والا ”کلیو“ کافی منطقی محسوس ہونے لگا تھا۔

☆☆☆

حالات نے اچانک ہی ایک ایسا رخ اختیار کر لیا تھا کہ ہم جو صرف شوگراں تک کا پروگرام لے کر یہاں پہنچے تھے اب آگے بڑھنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ ہمارے نہ چاہتے ہوئے بھی اب عمران ہمارے ساتھ شریک تھا۔ ہم بذریعہ کار شوگراں سے اسکردو کی طرف روانہ ہو گئے۔ روانہ ہونے سے پہلے ہم نے ایک مقامی گائیڈ کو وہ دھندلی تصویر دکھائی تھی۔ اس تجربہ کار گائیڈ نے بیک گراؤنڈ کے مناظر دیکھ کر محل وقوع کا ٹھیک ٹھیک اندازہ لگا لیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس کے تجربے کے مطابق یہ جگہ ”ہوشے“ نامی قصبے سے پچیس تیس کلومیٹر آگے اونچے پہاڑوں کے درمیان ہے۔ وہاں تک پیدل جایا جاسکے گا یا پھر لنگڑی قسم کی جیپیں ہی وہاں پہنچ پاتی ہیں۔ اس کے مطابق وہاں پہاڑوں میں کچھ سخت گیر قسم کے لوگ آباد بھی تھے مگر آباد علاقوں سے ان کا رابطہ بہت کم تھا۔ منصور نامی اس گائیڈ نے ہمیں ہاتھ سے بنایا ہوا ایک نقشہ بھی فراہم کیا جو اس مقام کی ٹھیک ٹھیک نشاندہی کرتا تھا...... تاہم گائیڈ کا کہنا تھا کہ وہ خود کبھی وہاں تک نہیں گیا...... اور اس نے بوجہ بیماری اب بھی جانے سے معذوری ظاہر کی تھی۔

ہماری گاڑی، نئی بنی ہوئی ہموار سڑک پر کاغان سے ناران کی طرف پھسلتی چلی جارہی تھی۔ میں ڈرائیو کر رہا تھا، عمران میرے ساتھ بیٹھا تھا۔ ماہین پچھلی نشست پر تھی۔ جھاگ اُڑاتا دریا ئے کنہار ہماری بائیں جانب نشیب میں بہہ رہا تھا۔ دونوں طرف سبزے سے ڈھکے ہوئے فلک بوس پہاڑ تھے، آبشاریں تھیں، ڈھلوانوں پر چھوٹے چھوٹے خوش رنگ گھر تھے جو دنیا کے ان خوب صورت ترین نظاروں کا حصہ تھے۔ سرما کی پہلی برف باری کے آثار جگہ جگہ دکھائی دے رہے تھے۔ میں اور عمران گفتگو کر رہے تھے مگر ماہین اس گفتگو میں زیادہ حصہ نہیں لے رہی تھی، وہ اپنے شاندار پیناسونک کیمرے کے ذریعے فلم بندی میں مصروف تھی۔

پروگرام یہی بنا تھا کہ ہم خود کو ایک ٹی وی پروڈکشن ٹیم کا حصہ قرار دیں گے۔ اور یہ ظاہر کریں گے کہ ایک بڑی ٹی وی سیریل کے لیے لوکیشنز وغیرہ دیکھنے کے لیے ان علاقوں کا کٹھن سفر کر رہے ہیں۔

عمران پُرخیال انداز میں بولا۔ ”سوچنے کی بات یہ ہے کہ فواد نے اپنے گھر والوں سے جھوٹ کیوں بولا۔ وہ ایسی کون سی ملازمت ہے جس کے لیے اسے ان دور دراز برفیلے پہاڑوں میں جانا پڑا؟“

”تنگدستی میں بندہ بہت کچھ کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن چاچو جان! یہ کیسی تنگدستی تھی جو سارا پاکستان چھوڑ کر بابوسر ٹاپ اور اسکردو وغیرہ سے آگے جا کر ہی دور ہو سکتی تھی؟“

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”ویسے مجھے حیرانی ہو رہی ہے کہ تم نے پرورش تو انڈیا میں پائی ہے مگر پاکستانی جغرافیے کے بارے میں اتنا کچھ جانتے ہو؟“

”آپ پھر میری دم پر پاؤں رکھ رہے ہیں چاچو۔ میں نے آپ کو بتایا بھی ہے کہ میں جدی پشتی پاکستانی ہوں۔ صرف پیدا ہونے کے لیے غلطی سے انڈیا چلا گیا تھا۔ آخر نومولود بچے سے غلطی ہو ہی جاتی ہے۔“

عمران کی اس مزاحیہ بات پر ماہین نے کوئی ردِعمل ظاہر نہیں کیا اور اپنے کیمرے کی طرف ہی متوجہ رہی۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ میرے چہرے پر بھی کوئی مسکراہٹ نہیں تھی۔ ”سوری، میں اپنا لطیفہ واپس لیتا ہوں۔“ اس نے کہا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

سفر طویل اور دشوار گزار تھا اور پھر یہ کوئی تفریحی سفر بھی

نہیں تھا۔ کئی طرح کے اندیشے ذہن میں کلبلا رہے تھے۔ اس لیے تھکن بھی زیادہ محسوس ہوئی۔ چلاس اور جگلوٹ سے ہوتے ہوئے ہم اسکردو کی یخ بستہ فضاؤں میں پہنچے اور وہاں شب بسری کا فیصلہ کیا۔ ایک آرام دہ ہوٹل میں دو کمرے لیے گئے۔ ایک میں ماہین اور میں رہے دوسرے میں عمران۔ برفانی ہوائیں رات بھر کھڑکیوں سے ٹکراتی رہیں۔ اب سفر کا خطرناک مرحلہ شروع ہونے والا تھا۔ ہتھیار کے نام پر میرے پاس صرف میرا سروس پسٹل تھا جو میں لاہور سے ہی لے کر چلا تھا۔

اگلے روز تین گھنٹے کے سفر کے بعد ہم ہوشے کے قصبے میں پہنچے۔ یہ وادی میں تھا اور یہاں سے ماشر بروم کی برف سے ڈھکی چوٹی صاف نظر آتی تھی۔ ہوشے میں میرا سروس کارڈ کام آیا۔ ہمارے لیے ایک پاورفل ڈسکوری جیپ اور ڈرائیور کا انتظام ہو گیا۔ ڈرائیور انعام خان نے کہا۔ ”برادر آگے راستہ بہت خراب ہے، ام آپ کو جہاں تک لے جا سکا ضرور لے جائے گا۔ اس سے آگے آپ خود پیصلہ (فیصلہ) کر لینا۔“

برف باری بہت زیادہ نہیں ہوئی تھی۔ اس کے باوجود کئی راستے مسدود ہو چکے تھے۔ ڈرائیور انعام خان نہایت چابکدستی اور مہارت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ہمیں بلند پہاڑوں کے درمیان کوئی پچیس کلومیٹر آگے تک لے گیا۔ اس سفر کے دوران ایک مقام پر ہمیں معروف زمانہ چوٹی عظیم الشان کے ٹو کی ہلکی سی جھلک بھی دکھائی دی۔

آخر ایک جگہ پہنچ کر ڈرائیور انعام خان اور فور وہیل جیپ کی ہمت جواب دے گئی۔ اب اس سے آگے ہمیں پیدل سفر کرنا تھا۔ ایک بار تو جی میں آئی کہ ہمارے ساتھ عورت ذات ہے۔ سفر بھی کٹھن ہے، خود کو مشکل میں نہ ڈالا جائے اور واپس چلے جائیں مگر جب میں نے ماہین سے بات کی تو وہ مجھے خود سے زیادہ متحرک اور پُرجوش محسوس ہوئی۔ عمران کا خیال بھی یہی تھا کہ اب اتنی دور آنے کے بعد اس گتھی کو سلجھایا جانا چاہیے۔ میں نے کہا۔ ”ایک اور بات تم دونوں کو ذہن میں رکھنی چاہیے۔ شوگراں میں گائیڈ نے کہا تھا کہ اس علاقے کے رہنے والے لوگ کچھ سخت گیر ہیں۔“

عمران بولا۔ ”پہاڑوں میں رہنے والے اکثر لوگ اخروٹ کی طرح ہوتے ہیں اوپر سے سخت اندر سے نرم۔“

تھوڑی سی بحث کے بعد فیصلہ ہوا کہ ڈرائیور انعام خان چار پانچ کلومیٹر نیچے جا کر ڈوڈانامی بستی میں ہمارا انتظار کرے گا۔ ہم واپسی پر اس سے وہیں ملیں گے۔

ٹریکنگ کی پوری تیاری کے بعد ہم سرد ہواؤں کا سامنا کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ گائیڈ کا ہاتھ سے بنایا ہوا نقشہ کافی حد تک ہماری رہنمائی کر رہا تھا۔ ماہین کو پورا یقین تھا کہ ہم اگلے چوبیس گھنٹوں میں اس شخص کا سراغ پانے میں کامیاب ہو جائیں گے جو اپنی ماں اور کمسن بیٹی کو روتا بلکتا چھوڑ کر بوجوہ ان دور دراز پہاڑوں میں چلا آیا ہے۔ ماہین کا یقین غلط نہیں تھا ہم فواد کا سراغ پانے والے تھے مگر ہمیں یہ ہرگز معلوم نہیں تھا کہ چند گھنٹے بعد ہماری نگاہیں ایک بڑے ہنگامے کا مشاہدہ کرنے والی ہیں......

☆☆☆

ہمیں پیدل چلتے ہوئے چار گھنٹے ہو چکے تھے۔ یہ سہ پہر کے بعد کا وقت تھا۔ اب ہواؤں میں شدت آ گئی تھی اور کہیں کہیں بادلوں کے مرغولے دکھائی دینے لگے تھے۔ البتہ کسی وقت سورج بھی بلند چوٹیوں کے درمیان سے جھلک دکھا دیتا تھا۔ ماہین مسلسل فوٹوگرافی کر رہی تھی۔ خود کوئی وی ٹیم کا حصہ ظاہر کرنے کے لیے میں ایک نوٹ بک میں لوکیشنز کے حوالے سے مختلف اندراجات بھی کر رہا تھا۔ لگتا تھا کہ ہم منزل سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ اچانک چیڑ اور دیودار کے درختوں کے درمیان ہمیں ایک تیز حرکت نظر آئی۔ پہلے تو ہم اسے کوئی جنگلی جانور سمجھے، لیکن پھر کسی گاڑی کے انجن کا مدھم شور سنائی دیا...... بلکہ شاید یہ دو گاڑیوں کے انجن تھے۔ پہلا سوال تو ذہن میں یہی آیا کہ جس مقام تک ہماری جیپ سخت کوشش اور مہارت کے باوجود نہیں پہنچ سکی وہاں یہ گاڑیاں کیسے پہنچ گئی ہیں؟ ابھی اس سوال کا جواب بھی نہیں ملا تھا کہ فاصلے پر اوپر تلے کئی فائر ہوئے پھر ہوا کے دوش پر تیر کر کچھ لوگوں کے گرجنے برسنے کی آوازیں کانوں تک پہنچیں۔ ان میں ایک نسوانی آواز بھی تھی۔

”یہ کیا ہے جی؟“ عمران نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا۔

ہم تینوں ڈھلوان پر بیس تیس قدم مزید آگے گئے اور پھر خود کو ایک برف پوش چٹان کے پیچھے چھپا لیا۔ اس سے آگے ایک دوسرے پہاڑ کی ڈھلوان تھی۔ یہاں سے ہمیں جو مناظر نظر آئے، وہ سنسنی خیز تھے۔ بلندی پر ایک سیاہ جیپ نظر آئی جو بُری طرح ایک درخت سے ٹکرائی ہوئی تھی۔ اس جیپ کے عقب میں اور اردگرد چند بندے موجود تھے جو نشیب کی طرف فائر کر رہے تھے۔ ایک جیپ ڈھلوان کے نچلے سرے پر بھی موجود تھی اور یہ فائرنگ ان جیپ سواروں پر ہی ہو رہی تھی۔ ہمارے سامنے ہی نیچے والے اپنی سرخ

جیپ سے نکلے اور تناور درختوں کی اوٹ لے کر جوابی فائر کرنے لگے۔

ماہین میرے پہلو میں بیٹھی تھی، تیز سرگوشی میں بولی۔ ”انکل تابی اوہ دیکھیں درمیان میں کیا ہے؟“

میں نے اس کی بتائی ہوئی سمت دیکھا، فاصلہ کافی تھا لیکن پتا چلتا تھا کہ یہ کوئی لڑکی ہی ہے جس نے پھولدار کپڑے پہن رکھے ہیں اور خود کو ڈھلوان پر دو ڈھائی فٹ کے ایک قدرتی چھجے کے نیچے چھپایا ہوا ہے۔ وہ دونوں طرف سے فائرنگ کی زد میں تھی۔ اگر اپنی پناہ گاہ سے نکلتی تو یقیناً کسی گولی کا شکار ہو جاتی۔ اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اوپر والوں کے ڈر سے چھپی ہوئی ہے۔

صورتِ حال ناقابلِ یقین حد تک سنگین تھی۔ نیچے صرف دو یا تین افراد تھے مگر اوپر زیادہ تھے۔ پھر ہماری نگاہوں کے عین سامنے نیچے موجود ایک شخص کو گولی لگی اور وہ مزید نشیب میں لڑھک گیا۔

عمران نے کہا۔ ”نیچے والوں کے لیے رسک زیادہ ہے۔ ان میں جو دو باقی ہیں، وہ بھی کسی وقت ”ہٹ“ ہو سکتے ہیں۔“

”لڑکی کو بھی دیکھو۔“ میں نے کہا۔ ”لگتا ہے کہ وہ ڈر کر نیچے کی طرف بھاگے گی۔ اس نے یہ غلطی کی تو فوراً اوپر سے نشانہ بن جائے گی۔“

ابھی بات میرے منہ میں تھی کہ بدحواس لڑکی نے اٹھ کر نیچے جانے کی کوشش کی۔ اس کے اردگرد چنگاریاں سی بکھر گئیں۔ وہ تڑپ کر پھر اپنی پناہ گاہ میں دبک گئی۔

”ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیے۔“ عمران نے کہا۔ اس کے گلے کی رگیں پھول گئی تھیں اور پیشانی تمتما اٹھی تھی۔ اس کے اس انداز نے مجھے کسی کا بھولا بسرا چہرہ یاد کرا دیا۔

سچویشن واقعی ایسی تھی کہ لڑکی کو فوراً مدد کی ضرورت تھی۔ میں نے ماہین کو وہیں رکنے کی تلقین کی اور عمران کے ساتھ تناور درختوں اور پتھروں کی آڑ لیتا ہوا، ان دو افراد کے پاس پہنچ گیا جو اپنی ہمت طاقت کے مطابق لڑکی کا دفاع کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک جواں سال شخص بڑے قیمتی لباس میں تھا، اس کے ہاتھ میں چمکتا ہوا کولٹ پسٹل تھا مگر اندازہ ہوتا تھا کہ اس کے پاس فالتو راؤنڈز نہیں ہیں یا بہت کم ہیں۔ دوسرا مقامی شخص جس نے شلوار قمیص پہن رکھی تھی، سیون ایم ایم رائفل سے مسلح تھا۔ ان سنگین لمحات میں دونوں کو غور سے دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔ اولین کام یہی تھا کہ نیچے پھنسی ہوئی لڑکی کو اوپر موجود نصف

درجن افراد سے بچایا جائے۔ ظالم کون تھا اور مظلوم کون، یہ بعد میں دیکھا جا سکتا تھا۔ نوے فیصد امکان یہی تھا کہ اوپر والے جارحیت کر رہے ہیں۔

قیمتی لباس والے نے حیرت سے ہم دونوں کو دیکھا۔

''آپ کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔'' میں نے اس کا کندھا تھپتھپایا اور اپنا پسٹل نکال لیا۔

اس سے پہلے کہ قیمتی لباس والا جواب میں کچھ کہتا۔ گولیوں کی ایک بوچھاڑ ہمارے سروں کے اوپر سے گزر کر درختوں میں پیوست ہوگئی۔ ہم نے سر جھکا لیے۔ اوپر والے اب بلند آہنگ میں گالیاں دے رہے تھے اور آہستہ آہستہ لڑکی کے قریب آ رہے تھے۔

کچھ دیر پہلے جس شخص کو ہمارے سامنے گولی لگی تھی، وہ ایک کھڈ میں برف پر مردہ پڑا تھا۔ البتہ اس کی آٹومیٹک رائفل ایک درخت کی جڑ میں نظر آ رہی تھی۔ عمران نے رائفل تھام لی اور قیمتی لباس والے کے پہلو میں پوزیشن لے لی۔

میں نے کہا۔ ''عمران کسی کو نشانہ نہیں بنانا۔ بس اس طرح فائرنگ کرو کہ وہ لوگ لڑکی کے قریب نہ آئیں۔''

عمران نے اثبات میں سر ہلایا۔

میں نے نفیس لباس والے نوجوان سے اردو میں کہا۔ ''میں اس لڑکی تک پہنچنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

میں نے پہلی بار اس نوجوان کی آنکھوں میں احسان مندی کے جذبات نمودار ہوتے دیکھے۔ اس کے ساتھ ہی یہ پتا بھی چلا کہ وہ اردو سمجھتا ہے۔ ایک لمحہ توقف کے بغیر میں اپنی اوٹ سے نکلا اور پتھروں کے ساتھ ساتھ پیٹ کے بل رینگتا ہوا اوپر کی طرف جانے لگا۔ دھند کے مرغولے مجھے زیادہ نمایاں ہونے سے بچا رہے تھے۔ میں روتی چلاتی لڑکی سے صرف تین چار میٹر دور تھا جب ایک چوڑا چکلا شخص کسی وزن دار پتھر کی طرح مجھ سے آٹکرایا۔ دس پندرہ سیکنڈ تک میرے اور اس کے درمیان اچھی خاصی لڑائی ہوئی۔ ایک موقع پر میں پشت کے بل گرا تو وہ آناً فاناً میرے اوپر آیا۔ میں نے گرتے گرتے ہی اسے اپنی ٹانگوں پر اچھال دیا۔ بڑی زبردست ٹائمنگ تھی۔ وہ اپنے ہی زور میں نشیب میں دور تک لڑھک گیا۔ میں تیزی سے اٹھا۔ ایک درخت کی اوٹ سے نکل کر ایک اور پہاڑی نے مجھ پر رائفل کی سنگین سے حملہ کیا۔ میں نے یہ خطرناک وار بچایا تو وہ پورا گھوم گیا اور عقب سے میری گرفت میں آ گیا۔ ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ اس کے ساتھ کیا سلوک کروں کہ اس کے اپنے ہی کسی ساتھی کی چلائی ہوئی دو گولیاں اس کے جسم میں پیوست ہو گئیں۔ ایک طرح سے اس کے جسم نے میرے لیے ڈھال کا کام کیا تھا۔ میں نے اس کی رائفل دبوچ کر اسے برف پر پھینکا اور لڑکی کے بالکل پاس پوزیشن لے کر چند ہوائی فائر کیے۔ یہ سخت وارننگ دیتے ہوئے فائر تھے۔ اوپر موجود لوگوں کی سمجھ میں آ گیا کہ میں جہاں پہنچ گیا ہوں وہاں سے انہیں بہ آسانی شوٹ کر سکتا ہوں۔ وہ پوزیشنیں چھوڑ کر مزید پیچھے چلے گئے۔ نیچے سے بھی گاہے بگاہے جوابی فائر ہو رہے تھے۔ لڑکی کو نکالنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ میں نے اس کا بازو پکڑ کر کھینچا تو پتا چلا کہ اس کے پاؤں میں فریکچر ہو گیا ہے یا سخت قسم کی موچ آ گئی ہے۔ وہ بس ''ہائے اُف'' کر کے رہ گئی۔ میں نے اسے کمر پر لاد لیا اور اِکا دُکا فائر کرتا ہوا الٹے قدموں نیچے اترنے لگا۔ یہ کافی مشکل کام تھا مگر میں دو تین منٹ میں لڑکی کو نیچے والی پوزیشن پر لے آیا۔

یہی وقت تھا جب نشیب میں بائیں جانب کے برف پوش درختوں میں دو تین جیپیں دکھائی دیں اور کچھ مسلح افراد کے للکارے سنائی دیے۔ عقب میں کچھ اور لوگ بھی آ رہے تھے۔ پتا چلا کہ یہ قیمتی لباس والے جواں سال شخص کے ساتھی ہیں۔ ان کے آتے ہی بلندی پر موجود لوگوں کی فائرنگ رک گئی اور اندازہ ہوا کہ وہ اپنی پوزیشن چھوڑ گئے ہیں۔ میں اور عمران یہ جان کر حیران ہوئے کہ آنے والے افراد قیمتی لباس والے کو پرنس کہہ کر مخاطب کر رہے ہیں اور بہت مؤدب ہیں۔ یہ لوگ جو زبان بول رہے تھے، وہ بلتستانی تو نہیں تھی تاہم اس سے ملتی جلتی تھی۔ بلتستانی بولی میں کافی حد تک جانتا تھا لہٰذا ان کی باتیں کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی تھیں۔ وہ پرنس سے پوچھ رہے تھے کہ کیا انہیں حملہ آوروں کا پیچھا کرنا چاہیے۔ اس نے انہیں منع کر دیا پھر وہ اپنے اس ساتھی کی طرف متوجہ ہوا جو گڑھے میں مردہ پڑا تھا۔ طاقتور رائفل کی گولی اس کا سینہ چیر کر پشت سے نکل گئی تھی۔ وہ کسی طبی امداد کے مرحلے سے گزر چکا تھا۔ پرنس میری طرف متوجہ ہوا اور میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر شکستہ اردو میں بولا۔ ''آپ نے بہت ہمت دکھائی اور بڑے نازک وقت پر میری مدد کی۔ میرے پستول میں بس تین چار راؤنڈ ہی باقی رہ گئے تھے۔''

پھر اس نے عمران کا کندھا بھی تھپکا۔ ''آپ دونوں کو یہاں دیکھ کر بہت حیرانی ہو رہی ہے۔ میں آپ دونوں سے بہت کچھ پوچھنا چاہ رہا ہوں لیکن ہم زیادہ دیر یہاں ٹھہر نہیں سکتے۔ یہاں سے نکلتے ہیں۔ محفوظ جگہ پہنچ کر آرام سے بات کریں گے۔'' تب وہ دائیں بائیں دیکھ کر بولا۔ ''کوئی اور تو نہیں آپ کے ساتھ؟''

"ہاں ایک اور ہے...... ہماری ساتھی ہے۔" میں نے کہا۔

عمران لپک کر عقب میں گیا اور ماہین کو وہاں سے نکال لایا جہاں ہم نے اسے رکنے کا کہا تھا۔ قیمتی کیمرا ماہین کے گلے میں تھا اور کیمرے کا اسٹینڈ اس کے ہاتھ میں جھول رہا تھا۔ پرنس نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر ارادہ ملتوی کر کے بولا۔ "فی الحال ہمیں یہاں سے فوراً نکلنا چاہیے۔ آپ تینوں میرے ساتھ میری گاڑی میں بیٹھ جائیے۔" اس نے شاندار سرخ جیپ کی طرف اشارہ کیا۔ یہ دشوار ترین راستوں کی شہزادی لینڈ روور تھی۔

موقع پر دو لاشیں بھی موجود تھیں۔ ایک پرنس کے ساتھی کی دوسری حملہ آوروں میں سے ایک کی۔ لاشوں کے بارے میں اپنے ساتھیوں کو ضروری ہدایات دینے کے بعد پرنس ہمارے ساتھ لینڈ روور میں آ بیٹھا۔ جس لڑکی کا پاؤں زخمی ہوا تھا، اس کا نام شانم معلوم ہوا۔ وہ عجیب سے لباس میں تھی۔ یہ لباس اس کے جسم کو چھپانے کے بجائے نمایاں کرتا تھا۔ اسے ایک دوسری جیپ میں بٹھا دیا گیا۔ برفانی چوٹیوں پر شام کے سائے گہرے ہو رہے تھے۔

☆☆☆

ہم پہاڑوں میں گھری ہوئی ایک چھوٹی سی بستی میں موجود تھے۔ بستی چھوٹی ہونے کے باوجود نہایت شاندار تھی۔ لکڑی اور پتھر کے بنے ہوئے گھر خوب صورت اور آرام دہ تھے۔ ولاز کی طرز کی کئی بڑی بڑی کوٹھیاں بھی نظر آ رہی تھیں۔ بیرونی دنیا سے تقریباً کٹی ہوئی اس بستی میں بُری بھلی سڑکیں بھی موجود تھیں۔ یہ سڑکیں یقیناً اپنی مدد آپ کے تحت بنائی گئی ہوں گی۔ اِکا دُکا جیپیں بھی متحرک نظر آئیں۔ اب اندھیرا گہرا ہو چکا تھا۔ بستی کے اکثر گھروں میں بجلی کی روشنی موجود تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ پن بجلی ان لوگوں نے مقامی وسائل سے ہی مہیا کی تھی۔ جس شاندار وسیع ولا میں ہمیں لایا گیا، وہ چھوٹے موٹے محل سے کم نہیں تھا۔ یہاں الیکٹرک لائٹس کی کمی کو پورا کرنے کے لیے گیس کے ہنڈولے بھی لگائے گئے تھے۔ باوردی ملازم اور مسلح گارڈز تیزی سے قدم اٹھاتے یہاں سے وہاں جا رہے تھے۔ سارے ماحول میں ایک سنسنی سی موجود تھی۔ اس سنسنی کا ماخذ شاید وہ واقعہ تھا جو ابھی تھوڑی دیر قبل ہوا تھا اور جس میں دو بندوں کی جان گئی تھی۔

مجھے عمران اور ماہین کو ایک مہمان خانے کے شاندار کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ ایک ملازم نے شکستہ اردو میں بتایا کہ پرنس ابھی تھوڑی دیر میں آپ سے دوبارہ ملاقات کرتے ہیں۔

عمران نے دیدے پھاڑ کر ارد گرد کی شان و شوکت دیکھی اور بولا۔ "یہ سب کیا ہو گیا چاچو، یہ ہم ایک دم کہاں سے کہاں آ گئے؟"

"کہاں سے کہاں آ گئے اور ایک سنگین قسم کے جھگڑے کا حصہ بھی بن گئے۔" میں نے کہا۔

ماہین بولی۔ "جب اندر آتے ہوئے آپ دونوں پرنس سے باتیں کر رہے تھے، میں نے تھوڑا دائیں ہٹ کر پارکنگ کی طرف دیکھا تھا۔ یہاں اس ولا میں سات آٹھ جیپیں موجود ہیں۔ یہ دو طرح کی جیپیں ہیں۔ کچھ لگژری ٹائپ، جس طرح کی جیپ میں ہم آئے ہیں اور دوسری پرانی اور سخت جان قسم کی۔ یہ پرانی جیپیں شاید اس علاقے میں پہنچنے کے لیے استعمال کی جاتی ہوں گی۔"

عمران بولا۔ "لیکن یار...... سس سوری ماہین، یہ گاڑیاں یہاں تک پہنچی کیسے ہیں، ہماری گاڑی تو نہیں پہنچ سکی۔"

"برف باری سے پہلے شاید راستہ اتنا زیادہ دشوار نہیں ہوتا ہوگا۔" میں نے جواب دیا۔

ماہین نے کہا۔ "آپ دونوں نے میری اصل بات تو سنی ہی نہیں۔ پارکنگ میں جو گاڑیاں موجود ہیں، وہ ایک اہم خبر دے رہی ہیں۔"

"کیا کہنا چاہتی ہو؟"

"انکل ان میں وہ بیڈ فورڈ کی اسکائی کلر جیپ موجود ہے جو لاہور میں دیکھی گئی تھی۔" ماہین کے لہجے میں دبا دبا جوش تھا۔ یہ واقعی ایک اہم اطلاع تھی۔

اس سے پہلے کہ ہم اس پر مزید تبصرہ کرتے، دروازے پر آہٹ ہوئی اور دو خواتین شائستہ انداز میں اجازت لے کر اندر آ گئیں۔ وہ دونوں دیدہ زیب بلتستانی لباس میں تھیں۔ انہیں دیکھتے ہی اندازہ ہو گیا کہ وہ ماں بیٹی ہیں۔ بیٹی کی عمر بائیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔ وہ خوب صورت تھی اور پڑھی لکھی نظر آتی تھی۔ پتا چلا کہ وہ دونوں پرنس کی قریبی عزیز ہیں۔ لڑکی کا نام شازینہ معلوم ہوا۔ وہ بہت تعریفی نگاہوں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اردو میں بولی۔ "پتا چلا ہے کہ آپ نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے شانم کی جان بچائی...... اور پرنس کی مدد بھی کی۔ ہم سب آپ کے بہت مشکور ہیں۔"

ادھیڑ عمر شائستہ خاتون نے بھی اپنی بیٹی کی تائید کی۔

میں نے اُن سے پوچھا کہ پرنس اب کہاں ہیں۔ خاتون نے جواب دیا۔ ”ساتھ کے گاؤں والوں سے جو جھگڑا ہوا ہے، اسی کے سلسلے میں گئے ہیں۔ اللہ کرے بات زیادہ نہ بڑھے۔ یہ دونوں بستیوں کا نقصان ہے۔“ ساتھ والی بستی کا نام بالاٹ اور اس بستی کا نام ”ذخیرہ“ معلوم ہوا۔

میں نے کہا۔ ”خاتون! یہ آپ لوگوں کے ذاتی معاملات ہیں لیکن میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہ اسی لڑکی شانم کا جھگڑا تھا؟“

”ہاں یہی سمجھ لیں۔“ خاتون نے گول مول سا جواب دیا پھر موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ ”ویسے اگر اُن کا بندہ مرا ہے تو ایک بندہ ہماری طرف سے بھی جان ہار گیا ہے۔ اللہ کرے یہ نئی مصیبت یہیں پر ختم ہو جائے۔“

وہ نئی مصیبت کا ذکر کر رہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کوئی پرانی مصیبت بھی موجود تھی۔ اتنے میں دلکش شازمینہ کی مترنم آواز نے مجھے چونکایا۔ ”اگر آپ بُرا نہ مانیں تو آپ کو انکل کہہ لوں؟“

”بصد شوق۔“ میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

”انکل! آپ لوگ اس دور دراز مقام پر کیسے......؟“

اس کا جواب تو ہم پہلے ہی اچھی طرح تیار کر چکے تھے۔ میں نے شازمینہ اور اس کی والدہ کو بتایا کہ ہم ایک ٹی وی پروڈکشن کے سلسلے میں اس علاقے کی ریکی کر رہے ہیں۔ ایک بہت بڑا پراجیکٹ ہے جس کی وجہ سے یہ ساری دشواری اٹھانا پڑ رہی ہے۔ ہم اپنے ڈرائیور کو کوسوں پیچھے چھوڑ کر پیادہ یہاں پہنچے ہیں۔“

ہمارے جوابات نے شازمینہ اور اس کی والدہ کو تو کافی حد تک مطمئن کر دیا، ابھی یہ پتا نہیں تھا کہ پرنس وغیرہ بھی مطمئن ہو سکیں گے یا نہیں۔

شازمینہ ہم سے تو کچھ ہچکچا رہی تھی لیکن ماہین کے ساتھ وہ جلد ہی گھل مل گئی۔ ایک اعلیٰ خاندانی طرز کی دلکشی اور نجابت کے باوجود اس میں متاثر کرنے والی سادگی اور بے تکلفی تھی۔ نوکر چاکر بھی اسے بڑی تعظیم دے رہے تھے۔

کچھ ہی دیر بعد شازمینہ نے ہم سے اجازت لی اور ماہین کو یہ شاندار عمارت دکھانے کے لیے مہمان خانے سے باہر لے گئی۔ اس کی والدہ بھی ساتھ ہی چلی گئیں۔

میں اور عمران اس آسمانی رنگ کی جیپ پر تبصرہ کرنے لگے جو یہاں اس ولا میں موجود تھی اور یہ ثابت کر رہی تھی کہ فواد کی تلاش کے سلسلے میں ہم درست مقام پر پہنچے ہیں۔ اس پوری عمارت میں ہلچل سی محسوس ہو رہی تھی۔ دو تین گاڑیاں ہمارے سامنے بڑی تیزی سے باہر نکلیں۔ رکھوالی کے کُتوں کا شور بھی سنائی دیا۔ پھر ہم نے چند مسلح گھڑسواروں کو بھی مہمان خانے کے سامنے سے گزرتے دیکھا۔

قریباً آدھ گھنٹے بعد شازمینہ اور ماہین دوبارہ نمودار ہوئیں۔ تھوڑی دیر میں ہی یوں لگنے لگا تھا جیسے وہ مدت سے ایک دوسرے کو جانتی ہوں۔ شازمینہ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے بڑی اپنائیت سے کہا۔ ”انکل! اگر آپ کی اجازت ہو تو ہم دونوں ڈنر اکٹھے ہی کر لیں؟“

میں نے انکار مناسب نہیں سمجھا۔ سردی حد سے بڑھ گئی تھی۔ آتش دان میں کوئلے دہک رہے تھے اور باہر سرد ہوائیں پتھریلی دیواروں سے سر پٹخ رہی تھیں۔

ماہین کی واپسی، رات گیارہ بجے کے لگ بھگ ہوئی۔ اس نے ولا کی شان و شوکت کی تعریف کی اور بتایا کہ پرنس کا اصل نام بخت آور ہے۔ وہ اس ساری پراپرٹی کا اکلوتا وارث ہے۔ پرنس کو چھوٹے خاقان بھی کہا جاتا تھا مگر پرنس کا لقب زبانوں پر زیادہ چڑھ گیا تھا۔ شازمینہ، پرنس بخت آور کی کزن تھی۔ وہ اسکردو کی رہنے والی تھی۔ پرنس کی فیملی سے اس کی دور کی رشتے داری تھی۔ آج کل وہ اپنی والدہ اور والد کے ساتھ یہاں اس ولا میں ٹھہری ہوئی تھی۔ ماہین نے کہا۔ ”جو کچھ مجھے معلوم ہوا ہے، اس کے مطابق عنقریب پرنس اور شازمینہ کی شادی ہونے والی ہے۔“

میرا دھیان پھر پرنس کی طرف چلا گیا۔ میں نے ماہین سے پوچھا۔ ”پرنس کی واپسی ہوئی یا نہیں؟“

”نہیں، ابھی تو نہیں، لیکن اہلِ خانہ کچھ مطمئن نظر آ رہے ہیں۔ یہ لوگ یہاں اپنے معاملات خود ہی حل کر لیتے ہیں۔ شاید کوئی پنچایت وغیرہ بیٹھی ہوئی ہے۔ تصفیہ ہو جائے گا۔ تاہم شازمینہ بتا رہی تھی کہ اب یہ لڑکی شانم اپنی بستی کے بجائے یہیں اس ولا میں رہے گی۔ کیونکہ مخالف پارٹی پھر اسے تنگ کرے گی۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ مخالف پارٹی کے لوگ ایک طرح سے شانم کو اس کی بستی سے اغوا کر کے لے جا رہے تھے۔ پرنس اور اس کے دو گارڈز کو پتا چل گیا اور انہوں نے ان لوگوں کو روک لیا......لیکن بات صرف اتنی سی نہیں ہے انکل۔ ان دونوں گروپوں میں ایک پہاڑ کی ملکیت کا جھگڑا کافی عرصے سے چل رہا ہے۔“

میرے ساتھ ساتھ عمران نے بھی تفہیمی انداز میں سر ہلایا۔

”وہ لڑکی اب کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”یہیں پر ہے۔ اُس کے پاؤں میں سخت موچ آئی

ہے۔ خاقان فیملی کے ذاتی ڈاکٹر نے اس کی مرہم پٹی کی ہے۔ وہ آپ کی بہت تعریفیں کر رہی تھی۔ کہہ رہی تھی کہ اگر آپ اسے کمر پر لاد کر نیچے نہ لاتے تو اب تک وہ یقیناً لاش بن گئی ہوتی۔''

پھر ذرا توقف کر کے بولی۔ ''ویسے انکل، باقی لوگ بھی آپ کی ہمت کی داد دے رہے ہیں۔ شاید آپ کو معلوم نہیں کہ جس بندے کو آپ نے الٹا کر کھڈے میں پھینکا تھا، وہ اس قبیلے کے خطرناک ترین بندوں میں شمار ہوتا ہے۔ کوئی اس کے سامنے آنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''یہ تو پھر میرے لیے بھی انکشاف ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

☆☆☆

ہمیں اس خاقان ولا میں اب تین روز ہو چکے تھے۔ کل رات پھر برف باری ہوئی تھی اور سردی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ یہاں ہماری خاطر مدارت شاہانہ انداز میں ہو رہی تھی۔ پرنس بخت آور ایک قدر داں اور نہایت مہربان شخص کے طور پر سامنے آیا تھا۔ وہ ہمیں اور خاص طور سے مجھے بہت عزت دے رہا تھا۔ وہ والدین کی اکلوتی نرینہ اولاد تھی۔ اس کی والدہ وفات پا چکی تھیں۔ والد جو بڑے خاقان کہلاتے تھے، بستر علالت پر تھے۔ اب سارے معاملات تیس بتیس سالہ پرنس ہی سنبھالتا تھا۔ لڑکی کے جھگڑے والا معاملہ اب سیٹل ہو چکا تھا۔ ولا میں جو ایک بے چینی سی پائی جا رہی تھی، وہ ختم ہو گئی تھی۔ میرے اور ماہین کے اندازے کے مطابق ایک دو ماہ کے اندر پرنس شادی کے بندھن میں بندھنے والا تھا۔ اسکردو کی خوشنما لڑکی شازینہ اور اس کے والدین اسی سلسلے میں اس خاقان ولا میں موجود تھے۔ لگتا یہی تھا کہ پرنس اور شازینہ کے بزرگ چاہتے تھے کہ شادی سے پہلے وہ دونوں ایک دوسرے کے طور اطوار سمجھ لیں۔

خاقان ولا میں نیلی بیڈ فورڈ جیپ تو ہمیں نظر آ گئی تھی مگر نہ کہیں فواد نظر آیا اور نہ وہ دبنگ عورت جو فواد کو لاہور سے اٹھا کر لے گئی تھی۔ ماہین کا خیال تھا کہ میں پرنس یا کسی اور سے نیلی جیپ کے بارے میں ٹوہ لوں مگر میں اس طرح کے سوال سے فی الحال اسے چونکانا نہیں چاہتا تھا۔ پرنس اپنی عمر سے کہیں زیادہ تجربہ کار اور جہاندیدہ نظر آتا تھا۔ لمبا قد، کھڑی ناک اور گہری بادامی آنکھیں، اس کی شخصیت کو نکھارتی تھیں۔

جس لڑکی شانم کے سلسلے میں جھگڑا ہوا تھا، وہ بھی ولا ہی میں موجود تھی۔ ایک دفعہ مہمان خانے کے سامنے لان میں بھی نظر آئی تھی۔ تھوڑا سا لنگڑا کر چل رہی تھی۔ اس کی صورت تو عام سی تھی مگر نہایت قابلِ ذکر بات یہ تھی کہ اس کا جسم عام نہیں تھا۔ وہ نہایت دلکش بلکہ ہوشربا جسم کی مالک تھی۔ اس کا پیکر اس کے لباس کے اندر سے پکارتا اور چنگھاڑتا ہوا نظر آتا تھا۔ اس کا لباس بھی باقی عورتوں کے لباس سے مختلف تھا۔ سردی کے باوجود اس کی پنڈلیاں اور نصف بازو عریاں نظر آتے تھے۔ ایک روز پہلے مجھے اور عمران کو ایک اور الجھن کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ہم لان میں بیٹھے تھے اور ولا کے ملازموں کو والی بال کھیلتے دیکھ رہے تھے۔ ایک لڑکی کھلاڑیوں کے لیے پانی لے کر آئی اور کھیل دیکھنے لگی۔ اندر سے ہیڈ ملازمہ نے کڑے انداز میں اسے پکارا۔ ''اے شانم! واپس آؤ۔'' وہ واپس چلی گئی۔

''ہائیں۔'' عمران نے دیدے گھمائے۔ ''یہ بھی شانم ہے؟''

اس سوال کا جواب اگلی رات مجھے مل گیا۔ یہ بھی ایک عجیب واقعہ تھا جو مجھے ششدر کر گیا۔ میں مہمان خانے میں اپنے آرام دہ نیم گرم کمرے میں سویا ہوا تھا۔ ایک ہلکی سی دستک نے مجھے جگایا۔ وال کلاک دیکھا، ایک بجے کا وقت تھا۔ باہر برفانی ہوائیں چل رہی تھیں۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہی شانم لنگڑاتی ہوئی اندر آ گئی جسے میں نے گولیوں کی بوچھاڑ میں بچایا تھا۔

اس نے یکایک جذباتی انداز میں میرے ہاتھ تھام کر چومنا شروع کر دیے۔ میں نے جلدی سے ہاتھ کھینچے اور دروازہ بند کیا کہ کوئی اس مشکوک منظر کو دیکھ نہ لے۔

''یہ کیا حرکت ہے شانم؟'' میں نے اردو میں پوچھا۔

پہلے تو اس نے کسی ناقابلِ فہم زبان میں ایک فقرہ بولا، پھر ٹوٹی پھوٹی اردو میں بولی۔ ''آپ بہت اچھا، لگتا ہے کہ اس دن دیوتاؤں نے آپ کو خاص میرے لیے بھیجا۔ آپ نے جس طرح اس علاقے کے سب سے خطرناک قاتل اور بدمعاش کو اٹھا کر کھڈ میں پھینکا، وہ منظر بھولنے والا نہیں ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ٹھیک ہے جو ہوا وہ ہوا۔ لیکن تم اب اس وقت یہاں کیوں موجود ہو؟''

کمرے میں نائٹ بلب کی مدھم روشنی تھی، وہ عجیب نظروں سے میری طرف دیکھتی رہی۔ آنکھوں میں ہلکی سی نمی نظر آ رہی تھی۔ پھر اس نے جو بات کہی، اس نے میرا دماغ بھک سے اڑا دیا۔ وہ بولی۔ ''آپ نے میری زندگی بچائی۔ میں اپنا آپ...... آپ کو دینے آئی ہوں۔ اگر آپ کو قبول ہو تو......''

میں سکتہ زدہ کھڑا رہ گیا۔ وہ معمولی صورت کی تھی اور جو بات کر رہی تھی، وہ اس سے بھی کہیں زیادہ معمولی تھی۔ میں نے اس کا سڈول بازو، کندھے کے پاس سے تھاما اور اسے دروازے کی طرف دھکیلا۔ وہ ایک دم میرے پاؤں میں بیٹھ گئی اور میری پنڈلیاں جکڑ لیں۔ وہ سسک اٹھی۔ پتا نہیں میں آپ کے قابل ہوں یا نہیں، مگر آپ اتنے اچھے ہیں کہ میں اپنا سب کچھ آپ پر قربان کر سکتی ہوں۔ اگر میں نے غلط بات کہی ہے تو مجھے معاف کر دیں۔''

وہ ایک سادہ پہاڑن تھی۔ اس کے عاجزانہ انداز نے میرا غصہ کم کر دیا۔ میں نے اسے اٹھایا اور سامنے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بے دام غلام کی طرح بیٹھ گئی۔ اُس کا پیکر تو بہ شکن تھا مگر مجھے اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ میری غرض یہ تھی کہ شاید وہ مجھے اس علاقے اور اس خاقان ولا کے بھیدوں کے بارے میں کچھ بتا سکے۔ تاہم سب سے پہلا سوال میں نے اس سے یہی کیا کہ اس نے میرے کمرے میں آکر ایسی گھٹیا بات کیوں کی ہے؟

وہ نظریں جھکا کر بولی۔ ''میں...... شانم ہوں۔''

''شانم ہوں؟ اس کا کیا مطلب ہے؟ کیا شانم تمہارا نام نہیں؟''

اُس نے اپنی سیاہ آنکھیں اٹھا کر ذرا حیرت سے میری طرف دیکھا اور بولی۔ ''شانم نام نہیں ہوتا۔ شانم تو ہمارا خاندان ہے۔ میری طرح اور بھی کئی شانم ہیں، دو چار یہاں خاقان ڈیرے (خاقان ولا) میں بھی موجود ہیں۔ ہمارا...... کک...... کام وہی ہے، جو میں نے آپ کو بتایا ہے۔''

میں ششدر رہ گیا۔ وہ دبے ہوئے مگر عجب بے باک لہجے میں کہنے لگی۔ ''دیوتاؤں نے مجھے اتنی عقل نہیں دی کہ میں کوئی زیادہ اچھی بات کہہ سکوں۔ بس میرے دل میں یہی آتا ہے کہ تین چار مہینے بعد جب میں پورے بائیس کی ہو جاؤں گی، میرے لوگوں نے مجھے کسی نہ کسی کے حوالے تو کر ہی دینا ہے۔ یہ میرے لیے بالکل عام سی بات ہوگی۔ لیکن اگر میں آپ کو کوئی خوشی دے سکوں اور آپ کے......'' شاید وہ اور بھی کچھ کہتی لیکن میرے کڑے انداز میں گھورنے پر چپ رہ گئی۔ اگلے پانچ دس منٹ میں اس لڑکی نے جو کچھ بتایا اور جو کچھ میں نے پوچھا، اس کا خلاصہ یہ ہے۔ پہاڑوں میں گھری ہوئی ان دو بڑی بستیوں کے درمیان بیس تیس گھروں پر مشتمل ایک اور چھوٹی سی بستی بھی تھی۔ یہ طوائفوں کی بستی تھی۔ اِن کو مقامی زبان میں شانم کہا جاتا تھا جس طرح یہ خاقان ولا تھا اور اس کے ارد گرد کی خوب صورت رہائش گاہیں تھیں، اسی طرح یہاں جو دوسری بڑی بستی متنازعہ پہاڑ کی پرلی طرف تھی وہاں بہراش ولا تھا۔ وہاں بھی کھاتے پیتے لوگوں کی کثیر تعداد آباد تھی۔ یہ لوگ خصوصی مہمانوں کی آمد پر یا موج میلے کے موقع پر شانم عورتوں کو تفریح طبع کے لیے بلاتے تھے اور انعام اکرام سے بھی نوازتے تھے۔ تاہم کچھ شرائط بھی تھیں جن میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ کوئی شانم لڑکی بائیس برس کی عمر تک پہنچنے سے پہلے کسی کے بستر پر نہیں جائے گی۔ یہ شانم جو اس وقت میرے سامنے بیٹھی تھی، اس کا اصل نام غنچہ تھا۔ یہ ابھی اکیس برس سے تھوڑا ہی آگے نکلی تھی۔ بہراش ولا کے کرتا دھرتا ٹھوک ٹھکرے کا دل اس پر آیا ہوا تھا۔ اس نے مقامی رواج کی خلاف ورزی کی اور اپنے کارندوں کے ذریعے غنچہ کو زبردستی اٹھوا لیا۔ پرنس بخت آور اس وقت اپنے دو گارڈز کے ساتھ جنگل میں کچھ گرے ہوئے درختوں کو اٹھوانے نکلا ہوا تھا۔ اس نے تیز رفتار جیپ میں غنچہ کے رونے چلّانے کی آوازیں سنیں اور مدد کے لیے لپک پڑا، بعد کے واقعات میں بیان کر چکا ہوں۔

غنچہ اپنی رام کہانی بیان کر چکی تو میں نے اُس سے اپنے مطلب کے دو تین سوالات پوچھے۔ ان میں سے ایک سوال نیلی جیپ کے بارے میں بھی تھا۔ میری امید کے برخلاف غنچہ نے اپنی ٹوٹی ہوئی اردو میں اس سوال کا جواب کھٹاک سے دیا۔ بولی۔ ''جہاں تک میرا اندازہ ہے جی وہ نیلی گاڑی پرنس جی کی پہلی بیوی کے پاس ہوتی ہے یا پھر...... کبھی کبھی ان کی ساس بھی اس میں سفر کرتی ہیں۔''

یہ ایک انکشاف تھا۔ ابھی تک شازمینہ نے ماہین کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ میں نے غنچہ سے کہا۔ ''مجھے پتا نہیں تھا کہ پرنس پہلے سے شادی شدہ ہیں۔''

وہ ہولے سے بولی۔ ''شادی شدہ تو ہیں جی...... لیکن بڑے دکھی ہیں۔ شادی کو چھ سات سال ہو گئے ہیں پر ابھی تک گھر میں کوئی رونق نہیں ہوئی۔ بہت علاج معالجہ بھی ہوا ہے۔ پشاور تک بھی گئے ہیں، کچھ لوگ تو کہتے ہیں کہ باہر کے ملکوں سے بھی دوائیں آتی رہی ہیں۔ اب لگتا ہے کہ نہ چاہنے کے باوجود پرنس جی نے دوسری شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔ پرنس جی کے والد بیمار رہتے ہیں، وہ آنکھیں بند ہونے سے پہلے خاقان ڈیرے کا وارث دیکھنا چاہتے ہیں......''

غنچہ بول رہی تھی مگر میرا دھیان نیلی جیپ اور پھر پرنس کی ساس میں اٹکا ہوا تھا۔ غنچہ بتا رہی تھی کہ پرنس جی کی ساس صاحبہ بھی کبھی کبھی وہ نیلی جیپ استعمال کرتی ہیں۔ تو کیا برف باری سے قبل جو ہٹی کٹی عورت یہاں سے طویل سفر کر

کے لاہور پہنچی تھی اور فواد کو اپنے ساتھ لائی تھی، وہ بھی پرنس کی ساس تھی۔ اگر ایسا تھا تو پھر یہاں کے حالات اور فواد میں کیا تعلق تھا؟ کیا فواد بھی اب اسی خاقان ولا میں موجود تھا یا وہ کہیں اور تھا؟

میں نے غنچہ سے پوچھا۔ ''یہاں ولا میں بہت سے ملازم ہیں، یہ زیادہ تر تو مقامی ہیں۔ کیا بھی کوئی پنجاب کا ملازم بھی یہاں رکھا گیا ہے؟''

وہ اس سوال کا کوئی واضح جواب نہ دے سکی۔ میں رات کے اس پہر اسے زیادہ دیر اپنے کمرے میں بھی نہیں رکھ سکتا تھا۔ کچھ نصیحتیں کرنے کے بعد میں نے اسے واپس بھیج دیا۔

☆☆☆

برف باری پھر شروع ہو چکی تھی۔ راستے بند تھے۔ پرنس بخت ہماری میزبانی کرتے ہوئے بہت خوش تھا۔ وہ اپنے بیمار والد سے بہت محبت کرتا تھا۔ ان کی بیماری اور غیر معمولی کمزوری کا خیال کرتے ہوئے پرنس نے انہیں ولا کے باہر کے حالات سے بالکل بے خبر رکھا ہوا تھا۔ تازہ جھگڑے میں دونوں طرف سے دو بندے دیرینہ دشمنی کی بھینٹ چڑھے تھے مگر پرنس نے اس بارے میں بھی والد کو کچھ نہیں بتایا تھا۔ پرنس کے سامنے میں نے خود کو ٹی وی پروڈکشن کا اسسٹنٹ ڈائریکٹر بتایا ہوا تھا۔ ماہین کو اسکرپٹ رائٹر اور عمران کو اہم ڈراما آرٹسٹ۔

پرنس کے ساتھ گپ شپ کے بعد میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا اور کھڑکی سے باہر برف کے گرتے گالوں کو دیکھ رہا تھا۔ ماہین، شازمینہ کے ساتھ رہائشی پورشن کی طرف گئی ہوئی تھی۔ ماہین اور عمران کو میں نے وہ سب کچھ بتا دیا تھا جو پرسوں رات مجھے شانم یعنی غنچہ سے معلوم ہوا تھا۔ ماہین اور عمران کے لیے بھی یہ ایک انکشاف تھا کہ پرنس پہلے سے شادی شدہ اور بے اولادی کی وجہ سے دوسری شادی کرنا چاہ رہا ہے۔

میں نے وال کلاک کی طرف دیکھا، رات کے دس بجنے والے تھے لیکن ماہین ابھی واپس نہیں آئی تھی۔ اچانک میرے کمرے کا دروازہ کھلا اور وہ ہانپتی ہوئی سی اندر آگئی۔ اس کے چہرے پر دبا دبا جوش تھا۔ ''خیریت ہے ماہین؟'' میں نے پوچھا۔

وہ دروازہ بند کرتے ہوئے بولی۔ ''خیریت سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ میں نے ابھی اس عورت کو دیکھ لیا ہے جو فواد کو لاہور سے زبردستی یہاں لے کر آئی ہے۔ میرا مطلب ہے کہ پرنس کی ساس۔''

''گڈ نیوز۔'' میں نے کہا۔ ''کہاں دیکھا؟''

''زنان خانے کے چھوٹے لاؤنج میں۔ کافی ہٹی کٹی ہے۔ عینک لگاتی ہے۔ کانی لڑا کو بھی نظر آتی ہے۔ جب میں نے دیکھا تب بھی لڑ ہی رہی تھی۔ پتا ہے کس کے ساتھ؟''

''شازمینہ کی امی کے ساتھ۔ بہت چبا چبا کر اور ہاتھ نچا نچا کر کچھ کہہ رہی تھی۔ شازمینہ کی امی بڑے دھیمے انداز میں جواب دے رہی تھیں۔ پھر ایک اور صورت مبارک نظر آئی۔ جانتے ہیں کس کی؟ پرنس کی پہلی وائف کی۔ چوبیس پچیس سال کی ہوگی۔ ہے تو کافی خوب صورت لیکن مزاج کی کچھ تیز بھی لگتی ہے۔ بس اُس کے ایک دو فقرے ہی میرے کان میں پڑے۔ ہٹی کٹی عورت کو 'ما' کہہ کر بلا رہی تھی۔ بظاہر تو یہی لگتا تھا کہ بات کو بڑھنے سے روکنا چاہتی ہے۔ پھر وہ ماں کو بازو سے پکڑ کر دوسری طرف لے گئی۔ پرنس کی اس پہلی وائف کا نام زوش جہاں معلوم ہوا ہے۔''

''شازمینہ نے کچھ بتایا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟''

''نہیں انکل، وہ بہت محتاط لڑکی ہے۔ گھر کے اندر کی کوئی بات مجھ سے نہیں کرتی۔ اس نے تو مجھے ابھی تک یہ بھی نہیں بتایا کہ پرنس پہلے سے شادی شدہ ہیں۔''

''کوئی اور نئی بات جو پتا چلی ہو؟''

''پرنس سمیت ولا کے سارے لوگ شازمینہ کو بہت پسند کرتے ہیں۔ شازمینہ اپنے والدین کے ساتھ دو تین ماہ سے یہیں خاقان ولا میں ہے...... اور لگتا یہی ہے کہ شاید ایک دو ہفتوں میں پرنس اور شازمینہ کی منگنی کی چھوٹی موٹی رسم بھی ہو جائے۔''

''ظاہر ہے کہ پرنس کی پہلی وائف اور مدر اِن لاء کو یہ صورتِ حال ہرگز پسند نہیں ہوگی۔ یوں اس چھت کے نیچے ایک طرح کی کشمکش اور چپقلش کی فضا چل رہی ہوگی چلو خیر، یہ ان لوگوں کے ذاتی معاملات ہیں، ہمارے سوچنے کی بات یہ ہے کہ پرنس کی ساس لاہور سے فواد کو یہاں کیوں گھسیٹ کر لائی ہے؟''

میں نے لاہور کا ذکر کیا تو ماہین کچھ پریشان نظر آنے لگی۔ ذرا توقف کر کے بولی۔ ''انکل تابی! میں حشام کی طرف سے فکرمند ہوں۔ وہ میرے لیے پریشان ہوگا۔ میں نے اسے صرف تین چار روز کا کہا تھا۔ یہاں تو سگنل ہی نہیں ہیں کہ اسے کال کی جا سکے......'' اسی دوران میں عمران دروازہ کھول کر اندر آ گیا۔ اُس نے ہڈ والی سیاہ برساتی پہن رکھی تھی۔ لگتا تھا کہ برف باری میں گھوم پھر کر آیا ہے۔ آتے

ساتھ ہی ماہین کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”لگتا ہے کہ حشام صاحب کا ذکرِ خیر ہو رہا ہے...... بے چارے بڑے پریشان ہوں گے...... ایک ایک دن گن گن کر گزار رہے ہوں گے؟“

ماہین کے چہرے پر ایک دم سنجیدگی کا سایہ لہرایا۔ متوازن لہجے میں بولی۔ ”عمران! میں آپ کی بہت عزت کرتی ہوں اور میں دل کی گہرائیوں سے چاہتی ہوں کہ یہ عزت برقرار رہے۔ آپ حشام کا ذکر اس طرح مزاحیہ انداز میں نہ کیا کریں۔“ وہ اٹھی اور بغیر کچھ مزید کہے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

عمران نے بیمار بکرے کی طرح گردن جھکا لی۔ میں نے کہا۔ ”سمجھ دار کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے۔“

وہ دلدوز آواز میں بولا۔ ”آپ بھی تو اشارہ سمجھ لیں نا۔ مجھے اب زیادہ دیر نہیں جینا ہے۔“

”زیادہ دیر تو کوئی بھی نہیں جیتا۔ بہت ہوا تو اسّی نوّے سال۔“

”سالوں کی نہیں گھنٹوں کی بات کر رہا ہوں۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ آج صبح نہار مجھے خودکشی کرنا پڑے گی۔“

”صبح نہار کیوں، نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔“

”میرے پاس صرف تین چوہے مار گولیاں ہیں۔ انسان کے مرنے کے لیے یہ ڈوز کم ہے۔ میں اسے خالی پیٹ کھاؤں گا تو روح جلدی نقش فریادی سے پرواز کر جائے گی۔“

”نقش فریادی نہیں، قفسِ عنصری۔“

”جو بھی ہے، پرواز تو کرے گی نا۔ آپ کو جو وہم ہے میرے بارے میں پورا ہو کر رہے گا۔“

”اگر ارادہ پکا ہے تو پانچ چھ مزید گولیوں کا انتظام میں کر دیتا ہوں۔“ میں مسکرایا۔

”مگر چند گھنٹے مزید جینے کی ایک وجہ اور بھی ہے۔ میں آپ کو کچھ بتا کر جانا چاہتا ہوں۔“ اس کی آنکھوں میں ایک چمک سی نمودار ہو گئی۔ اپنی ٹھوڑی کھجانے لگا۔ ظالم گاہے بگاہے اپنے باپ کا انداز یاد کرا دیتا تھا۔ اس نے اٹھ کر دروازے کو اچھی طرح بند کیا اور بالکل پاس بیٹھ کر بولا۔ ”برف باری تو ہے پر بہت ہلکی ہے۔ میں ولا سے نکل کر کافی دور چلا گیا تھا......“

”تو دور کیوں چلے گئے تھے۔ ان لوگوں نے کہا بھی ہے کہ دشمن داری ہے، احتیاط کرنا ہو گی۔“

”اتنی دور بھی نہیں گیا تھا۔ آپ جھگڑالو بیوی کی طرح پوری بات تو سنتے نہیں۔“ وہ مزید سنجیدہ ہو گیا۔ ذرا دھیمے لہجے میں گویا ہوا۔ ”جوں جوں بستی سے آگے جاتے ہیں۔ آبادی چھدری اور درخت زیادہ ہوجاتے ہیں۔ میں ذرا بلندی پر کھڑا تھا۔ نشیب میں، میں نے ایک ایسے سینڈو ٹائپ بندے کو دیکھا جو ہمارے جانے ہوئے حلیے کا لگتا تھا۔ میرا مطلب ہے کہ جو دو بندے پرنس کی ساس کے ساتھ لاہور آئے تھے ویسا ہی حلیہ۔ اس سینڈو ٹائپ بندے کے ساتھ گرم چادر میں لپٹی ہوئی کوئی لڑکی بھی تھی۔ اتنے میں میرے والے راستے تین چار گھڑ سوار آتے دکھائی دیے۔ یہ ہلکی سبز وردیوں والے، پرنس کے پہریدار تھے۔ آپ جانتے ہی ہیں وہ وقتاً فوقتاً ایک بگل جیسی چیز بجاتے ہیں۔ جب انہوں نے یہ بگل بجایا تو نیچے وہ سینڈو ٹائپ بندہ بُری طرح ٹھٹکا اور لڑکی سمیت ایک طرف اوجھل ہو گیا۔ میں چونکہ بلندی پر تھا اس لیے سب دیکھ رہا تھا۔ پہریدار جب دائیں طرف مڑ کر دور چلے گئے تو سینڈو پھر اپنی جگہ سے نکلا اور لڑکی کے ساتھ ایک طرف چل دیا۔ ابھی برف باری بہت ہلکی تھی۔ شک کی وجہ سے میں ان دونوں کے پیچھے چل پڑا۔ بڑی احتیاط سے دس پندرہ منٹ اُن کا پیچھا کیا۔ ہم ڈھلوان پر پہنچ گئے۔ یہاں گھر فاصلے فاصلے پر ہیں۔ ایسے ہی ایک بڑے گھر کے گیٹ کے سامنے جا کر سینڈو اور لڑکی اوجھل ہو گئے۔ آپ کو پتا ہے کہ درختوں سے گھرے ہوئے اس گھر میں کون رہتا ہے؟“

میں نے سوالیہ نظروں سے عمران کو دیکھا۔

”وہی عورت جو پرنس کی ساس ہے۔ اس کا کوئی بھتیجا بھی اس کے ساتھ ہوتا ہے لیکن وہ کبھی کبھار ہی وہاں جاتی ہے۔ اکثر یہاں خاقان ولا میں اپنی بیٹی زرش جہاں سے چمٹی رہتی ہے۔“

”تم نے کیا اندازہ لگایا۔ یہ کیا چکر ہوگا؟“

”کیا چکر ہوگا، یہ تو پتا نہیں لیکن کوئی چکر ہے ضرور۔ مجھے وہ گھر پُراسرار سا لگا ہے۔ اندر سے دیوہیکل کتوں کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ ایک شیڈ تلے دو تین گھوڑے بھی بندھے ہوئے تھے۔“

اگلے روز سہ پہر تک برف باری بالکل تھم گئی۔ آسمان صاف شفاف ہو گیا۔ رات کو مشرقی چوٹیوں سے پوری رات کا چاند نمودار ہوا تو خاقان ولا کی بالکونی سے انوکھا نظارہ دکھائی دیا۔ حیرت گم ہو گئی۔ دور دور تک برف کی ہموار چادر اور اس پر چھٹکی چاندنی۔ درختوں پر سفید گالے دمکتے ہوئے اور ماشر بروم، گیشر بروم کی چوٹیوں پر نقرئی آبشاروں کی موجودگی کا گمان۔ بڑھتی ہوئی سردی کے سبب پرنس کے والد

محترم بڑے خاقان کی طبیعت خراب تھی۔ پرنس دو ڈاکٹرز کے ساتھ ان کی نگہداشت میں مصروف تھا۔ میں اور عمران گھومنے پھرنے کے لیے خاقان ولا سے باہر چلے گئے۔ ہم نے برف پر چلنے والے لانگ بوٹ پہن رکھے تھے اور ہاتھوں میں واکنگ اسٹکس تھیں۔ عمران اور ماہین آج کل بھاری بھرکم کپڑوں میں نظر آتے تھے لیکن میرا جسم موسمی اثرات کا اتنا عادی ہو چکا تھا کہ مجھے کسی خصوصی اہتمام کی ضرورت نہیں تھی۔ دو پہرے دار میرے اور عمران کے عقب میں تھے۔

کچھ دیر بعد ہم نے انہیں اس ڈیوٹی سے آزاد کر دیا اور لطف اندوز ہونے والے انداز میں قریبی ڈھلوان پر گھومنے لگے۔ ہمارا رخ بتدریج اس سمت تھا جہاں کل عمران نے باڈی بلڈر ٹائپ شخص اور لڑکی کو مشکوک انداز میں گم ہوتے دیکھا تھا۔ یہاں واقعی درخت زیادہ اور آبادی کم تھی۔ گھڑسوار پہریداروں کی ایک ٹولی بگل بجاتی، بالائی راستے سے گزر کر آگے چلی گئی تو ہم تیزی سے گھوم کر اس پتھریلی عمارت کے عقب میں آگئے جو کسی بہت بڑی خاکستری چمگادڑ کی طرح ایک سفید ڈھلوان پر اپنے پر پھیلائے موجود تھی۔ عمارت کا کچھ حصہ دو منزلہ تھا اور اوپر مخروطی چھت تھی جس پر دو تین فٹ موٹی برف نظر آ رہی تھی۔ عمران کے چہرے کی چمک بتانے لگی کہ وہ عمارت میں گھسنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ اس کے بیان کے عین مطابق عمارت کا زیادہ تر حصہ تاریک تھا۔ اندر سے گاہے بگاہے کتوں کی آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔ یہ یقیناً جسیم کتے تھے اور تعداد تین چار سے کم نہیں تھی۔

عمران دیوار پھاندنے کے موڈ میں تھا۔ ”کیسے جاؤ گے؟ کتے حملہ کر دیں گے؟“

”چاچو جانی، آپ کے پاس آپ کا سروس پسٹل ہے۔“

”یعنی گولی چلاؤں اور یہ لوگ پکڑ کر ہمیں چلا دیں۔ تم جانتے نہیں، اپنے کتوں کے حوالے سے یہ لوگ بڑے ”کھچی“ ہوتے ہیں۔“

وہ مسکرایا۔ ”مذاق کر رہا تھا۔ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔“

پلک جھپکتے میں وہ دیوار پر چڑھ گیا۔ میں روکتا رہا لیکن وہ اندر کود گیا۔ وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ کتے اس کی طرف لپکے۔ ان کا شور بلند ہوا مگر پھر ایکا ایکی خاموشی چھا گئی۔ چند ہی لمحے بعد عمران نے چار دیواری کا چھوٹا سا عقبی دروازہ کھول دیا۔ اس کے گرد تین جسیم السیشین کتے موجود تھے۔

مجھے دیکھ کر انہوں نے پھر اپنے کان کھڑے کیے مگر عمران گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا اور انہیں پچکارنے لگا۔ خطرناک کتوں کا انداز دوستانہ ہو گیا۔ اس کی یہ صلاحیت غیر معمولی تھی اور میں کم از کم دو دفعہ پہلے بھی بقائمی ہوش و حواس اس کا تجربہ کر چکا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس کے ڈی این اے میں بھی وہ ساری ناقابل فہم صلاحیتیں کسی نہ کسی درجے موجود ہیں جو اس کے باپ میں تھیں۔ کئی بھولے بسرے مناظر پلک جھپکتے میں نگاہوں میں گھوم گئے۔ چند سیکنڈ بعد قدآور کتے دائیں بائیں ہو گئے۔

کڑک سردی تھی۔ چاندنی بلند درختوں میں سے چھلک رہی تھی۔ ہم دیواروں کے سائے سائے چلتے ایک اندرونی دروازے تک پہنچ گئے۔ خوش قسمتی سے وہ کھلا ملا۔ اب ہم رسک لینے کے لیے تیار ہو چکے تھے۔ میں نے اپنی جیکٹ میں سے پستول نکال کر ہاتھ میں لے لیا تھا۔ سانس منہ سے بھاپ بن کر خارج ہو رہی تھی۔ ہم ایک پتھریلی راہداری میں پہنچے...... اور پھر تھوڑی سی کوشش کے بعد ایک نیم روشن لابی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔ کسی کمرے سے بولنے کی مدھم آوازیں آ رہی تھیں۔ قسمت ساتھ دے رہی تھی۔ ہم وزنی لکڑی کی ایک کھڑکی میں تھوڑی سی درز ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے۔ یہاں ایک بڑا آتشدان دہک رہا تھا اور شاید اسی آتشدان کی وجہ سے کھڑکی کو پورا بند نہیں کیا گیا تھا۔ کمرے کے فرش پر دبیز قالین تھا۔ پرانی طرز کے فرنیچر نے اس کمرے کو کلاسیکل رنگ دے رکھا تھا۔ سامنے ہی طاق میں دو تین چھوٹے چھوٹے مجسمے بھی نظر آ رہے تھے۔ یہ دیوی دیوتاؤں کے لگتے تھے۔ کشادہ پلنگ پر جو شخص نیم دراز تھا اسے دیکھ کر ہم حیران رہ گئے۔ وہ لاہور کی اس کم سن نایاب کا باپ تھا جو ہفتوں سے رو رو کر ہلکان ہو رہی تھی۔ اپنی بیٹی اور ماں سے سیکڑوں میل دور یہ شخص اس برف زار میں بستر پر لیٹا تھا اور اس کی ایک پنڈلی پٹیوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس کے قریب جو ادھیڑ عمر عورت آرام کرسی پر پھیل کر بیٹھی ہوئی تھی وہ پرنس بخت کی دبنگ ساس تھی۔ اس کے جسم پر کیلاشی رنگ ڈھنگ کے کپڑے تھے اور اس کا سرخ و سپید چہرہ آتشدان کی روشنی میں تمتما رہا تھا۔ اس کی آواز صاف ہمارے کانوں تک پہنچی۔ وہ شکستہ اردو میں بول رہی تھی۔ ”دیکھو، تم بھاگنے کی کوشش کرو گے تو مجھے غصہ تو آئے گا۔ تم جانتے ہو میں نے قسم کھا رکھی ہے کہ تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ میں اس قسم کی زنجیر میں جکڑی ہوئی ہوں۔ تم جانتے ہو میں بُری عورت نہیں ہوں لیکن مجھے اس

خرانٹ عورت کی وجہ سے بُرا بننا پڑا ہے جو اپنی بیٹی کے ساتھ خاقان ولا میں آئی ہے اور چوڑی ہو کر بیٹھ گئی ہے۔ مجھے نفرت ہے اس کی شکل سے اور نیت سے۔" پرنس کی ساس اندرانا جان کا چہرہ کچھ اور تمتما گیا (ہمیں اس عورت کا بھی نام معلوم ہوا تھا)

فواد عجیب لہجے میں بولا۔ "لیکن آپ نے مجھے کس جرم کی سزا دی۔ کیوں مجھے اس دلدل میں دھکیلا۔ میں یہاں سے نکلنا چاہوں بھی تو نہیں نکل سکتا۔ وہ سب کچھ نہیں بھولا جائے گا مجھ سے۔"

"وقت بہت بڑا مرہم ہوتا ہے فواد ے۔ تھوڑا ٹائم گزرنے دو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ زندگی کسی ایک کے لیے تباہ نہیں کی جاتی۔"

"میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں اسی لیے میں نے آپ سے کہا تھا مجھے اس گناہ کی طرف نہ لے جائیں۔ گناہ کتنا بھی خوب صورت ہو...... ہوتا تو گناہ ہے۔ اب میں اس گناہ کے عذاب میں ہوں۔"

"سب ٹھیک ہو جائے گا" وہ ذرا سخت لہجے میں بولی۔ "بس ہٹ دھرمی مت دکھاؤ۔ اپنا دھیان کسی اور طرف لگاؤ۔ میں پھر اُس شانم لڑکی کو بھیجتی ہوں۔ کیا وہ کسی سے کم خوب صورت ہے؟"

فواد نے ایک بار پھر بے قراری سے دائیں بائیں سر ہلایا۔ جیسے خاموشی کی زبان میں اندرانا جان کی بات کو رد کر رہا ہو۔ وہ اس کی طرف دھیان دیے بغیر اٹھی اور لکڑی کا وزنی دروازہ کھول کر باہر چلی گئی۔

میں بستر پر نیم دراز فواد کو بغور دیکھ رہا تھا۔ نجانے کیوں مجھے لگا کہ اس کی شکل میں پرنس بخت سے مشابہت پائی جاتی ہے۔ ویسا ہی کتابی چہرہ، کھڑی ناک، گہری بادامی آنکھیں، بالوں کا اسٹائل بھی ملتا جلتا ہی تھا۔ مزید یہ کہ قد کاٹھ میں بھی وہ پرنس ہی کی طرح لگ رہا تھا۔ تو کیا کسی طور لاہور کا یہ ویگن ڈرائیور پرنس بخت آور کا رشتے دار تھا؟ یہ خیال بہت مضحکہ خیز اور کسی حد تک فلمی لگ رہا تھا۔ ایسے بچھڑے ہوئے رشتے دار یا جڑواں بچے وغیرہ پاک و ہند کی فلموں میں ملتے ہیں۔ بہر حال جو کچھ میں محسوس کر رہا تھا، اس سے بھی انکار ممکن نہیں تھا۔

میں اور عمران نیم تاریکی میں اسی طرح کھڑکی سے لگے ہوئے تھے۔ اچانک کمرے کا دروازہ کھلا اور نگاہیں چندھیا سی گئیں۔ خوب صورت مگر واہیات نظارہ تھا۔ بائیس تئیس سال کی ایک حسین لڑکی نہایت مختصر لباس میں اندر داخل ہوئی۔ اس کے سیاہ بال شانوں پر تھے اور دانت لشکارے مار رہے تھے۔ یقیناً یہی وہ شانم لڑکی تھی جس کا ذکر تھوڑی دیر پہلے اندرانا جان نے کیا تھا۔

عمران نے میرے کان میں مدھم سرگوشی کی۔ "میرا خیال ہے کہ یہی وہ لڑکی ہے جو کل سیٹڈو ٹائپ بندے کے ساتھ آئی تھی۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ لڑکی کمال بے تکلفی سے فواد کے پہلو میں لیٹ گئی اور اپنے بائیں ہاتھ کی انگلیاں فواد کے سر کے بالوں میں چلانے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ اشتعال دلانے والے انداز میں اپنا جسم فواد کے جسم سے مس کر رہی تھی۔ فواد نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں اور اس کے چہرے پر گریز اور اکتاہٹ کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ پیشہ ور شانم لڑکی کی پیش قدمی مزید بڑھی تو فواد ایک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ "خدا کے لیے چلی جاؤ، مجھے تم سے کچھ لینا دینا نہیں...... چلی جاؤ۔" وہ دہاڑا اور اس نے طیش کے عالم میں شیشے کا ایک منقش جگ اٹھا کر دیوار پر پٹخ دیا۔ لڑکی بھی جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ شیشہ ٹوٹنے کی آواز رات کے سناٹے میں دور تک گونجی۔ کسی قریبی کمرے سے غالباً اندرانا جان کے بولنے کی مدھم آواز آئی۔ پھر بھاری قدموں کی تیز چاپیں سنائی دینے لگیں۔ ایک یا دو پہریدار اس جانب آ رہے تھے۔ اب ہمارے یہاں رکنے کا مطلب سیدھا سیدھا ٹکراؤ تھا۔ میں نے عمران کا کندھا دبایا۔ ہم الٹے قدموں پیچھے ہٹے۔ راہداری سے گزر کر عقبی دروازے تک پہنچے اور باہر نکل آئے۔ السیشین کتوں نے اس بار بھی عمران کے اردگرد چکرانے کے سوا کچھ خاص نہیں کیا تھا۔ دروازہ بند کر کے ہم کڑاکے کی سردی میں تھوڑا سا بھاگے، پھر محفوظ فاصلے پر پہنچ گئے...... اور عام رفتار سے چلنے لگے۔

☆☆☆

اس خاقان ولا میں کچھ نہ کچھ ایسا ہو رہا تھا جو انوکھا تھا اور یہ جو بھی انوکھا پن تھا، اس کا تعلق کسی نہ کسی طور "اندرانا" سے اور اس کی بیٹی زرش جہاں سے تھا۔ میرے اور عمران کے ذہن میں بہت سے سوال اٹھ رہے تھے۔ اندرانا نے فواد کو یہاں لا کر خفیہ طریقے سے کیوں رکھا ہوا تھا؟ وہ فواد کا دھیان کس عورت کی طرف سے ہٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ لاہور میں بھی اس نے فواد سے ایک فقرہ بولا تھا...... سمجھ لو فواد تم نے جو کچھ دیکھا، وہ ایک دھوکا تھا۔ وہ بھی تم سے ملی ہی نہیں تھی۔ پھر ایک سوال یہ بھی تھا کہ فواد کا ڈیل ڈول اور اس کے نقش پرنس بخت سے کیوں ملتے تھے؟

ماہین آج کل اپنا زیادہ وقت شازمینہ اور اس کی شائستہ مزاج والدہ بیگم وردا کے ساتھ گزارتی تھی۔ وہ دور سے میرے کمرے کی طرف آتی دکھائی دی تو عمران میرے پاس سے کھسک کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ وہ ظاہر نہیں کر رہا تھا لیکن حقیقتاً اس روز ماہین کی سرد مہری کا اثر اس نے لیا تھا۔ ماہین نے سمور کی واسکٹ کی جیبوں میں ہاتھ گھسیڑ رکھے تھے۔ اپنے خوب صورت بالوں کو ہلکورا دیتی ہوئی میرے سامنے بیٹھ گئی۔ ''کیا نئی تازی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ''انکل تابی! آپ تو ایک دم ہیرو بن گئے ہیں یہاں۔ دراصل شروع میں شام غنچہ کو بچاتے ہوئے آپ نے جس عالم خان نامی بندے کو دھول بلکہ برف چٹائی تھی، وہ کوئی معمولی بندہ نہیں ہے۔ لوگ اس کے سائے سے بھی کترا کر گزرتے ہیں۔ بغیر کسی ہتھیار کے کئی بندوں کی جان لے چکا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس جیسا کلہاڑی باز اس علاقے نے بلکہ اردگرد کے علاقوں نے آج تک پیدا نہیں کیا۔''

میں نے کہا۔ ''سیانے کہتے ہیں نا کہ بے خبری بھی ایک نعمت ہوتی ہے۔ اگر موصوف کے بارے میں مجھے پہلے ہی یہ سب کچھ پتا ہوتا تو شاید میں اتنی آسانی سے اسے زیر نہ کر پاتا۔''

وہ شوخی سے بولی۔ ''بہر حال جی، اب تو آپ کے سینے پر یہ تمغا لگ گیا ہے۔ کل جب آپ لان میں پرنس کے ساتھ بیٹھے چائے پی رہے تھے، زنان خانے کی خواتین اور ملازمائیں کھڑکیوں سے آپ کو دیکھ رہی تھیں اور وہ غنچہ تو آپ کے نام کی مالا جپتی پھرتی ہے۔ میں نے خواتین کو بتایا ہے کہ میرے انکل صرف ٹی وی سے منسلک ہی نہیں ہیں، ماضی میں وہ ایک زبردست مارشل آرٹسٹ رہے ہیں اور اب بھی ایک جانے مانے فائٹر ہیں۔''

میں نے کہا۔ ''کل کو یہ بھی بتا دینا کہ میرا تعلق پولیس سے ہے اور ہم یہاں کوئی لوکیشن وغیرہ دیکھنے نہیں آئے، پرنس کی ساس صاحبہ کا تعاقب کرتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں۔''

وہ مسکرائی اور اس کے گال کا ڈمپل نمایاں ہو گیا۔ ''نہیں انکل تابی، اب اتنی بھی مخبوط الحواس نہیں ہوں بلکہ آج کل میں نے اپنے سارے حواس جگا رکھے ہیں۔ یہاں کے حالات کے بارے میں کافی کچھ پتا چل رہا ہے۔'' وہ دھیمی آواز میں بولی۔

ماہین کی باتوں سے پتا چلا کہ خاقان ولا میں ایک سرد جنگ چل رہی ہے۔ اپنے بیمار والد کی پُرزور خواہش پر پرنس دوسری شادی کے لیے ذہن بنا رہے ہیں۔ شازمینہ اور ان کے والدین کو اسی لیے خاقان ولا میں بلایا گیا ہے کہ شازمینہ یہاں کے ماحول سے مطابقت پیدا کر سکے۔ یہ صورتِ حال پرنس کی مدر اِن لاء کے سینے پر مونگ دل رہی ہے۔ وہ شازمینہ اور اس کے گھر والوں کو یہاں برداشت نہیں کر پا رہیں۔ ہر روز کوئی نہ کوئی چھوٹا موٹا جھگڑا کھڑا ہو جاتا ہے۔

میں نے ماہین سے پوچھا۔ ''پرنس کی وائف زرش جہاں کا کردار کیسا ہے؟''

''وہ بہت خوب صورت ہے انکل مگر زیادہ پڑھی لکھی نہیں اور کچھ خاموش طبع بھی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ اپنی والدہ کے بہت زیادہ اثر میں ہے۔ والدہ کی کوئی بات بھی ٹال نہیں سکتی۔ اکلوتی اولاد ہونے کی وجہ سے والدہ سے اٹیچ بھی بہت ہے۔''

''یقیناً وہ بھی نہیں چاہتی ہو گی کہ اس کا شوہر دوسری شادی کے بارے میں سوچے؟''

''بالکل ایسا ہی ہے۔ تاہم یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات کبھی بھی بہت زیادہ اچھے نہیں رہے ہیں۔ شاید اس کی وجہ مزاجوں کا فرق اور بے اولادی بھی ہو۔''

''کیا تمہیں لگتا ہے کہ پرنس اور شازمینہ رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو جائیں گے؟''

''ابھی تک تو صورتِ حال شازمینہ کے لیے موافق ہی ہے۔ ولا میں سب لوگ اسے پسند کر رہے ہیں مگر ایسی بات بھی نہیں کہ زرش جہاں کو ناپسند کیا جاتا ہو، یہاں کے مکینوں اور ملازمین میں سے کچھ لوگ زرش کے حق میں بھی ہیں۔ شاید ان لوگوں کا خیال ہے کہ پرنس اور ان کی فیملی کو چاہیے کہ ابھی اولاد کے لیے کچھ مزید انتظار کریں۔''

''مگر اب مسئلہ پرنس کے بیمار والد صاحب کا بھی تو ہے۔ میں کل ملا تھا اُن سے انہیں جگر کا سنگین عارضہ ہے۔ لگتا ہے زیادہ دن نہیں جی پائیں گے۔''

ماہین نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''کل یہاں کی ہیڈ ملازمہ بھی کچھ ایسی ہی بات کہہ رہی تھی۔'' میں نے ماہین کو مختصر الفاظ میں بتایا کہ کل رات میں اور عمران کس کارروائی پر نکلے تھے اور ہم پر کیا انکشاف ہوا ہے۔ ماہین ششدر ہو کر سنتی رہی۔ فواد کا یہاں موجود ہونا اور اندرا نا کے گھر میں پابند ہونا؟ ماہین کے لیے بھی حیران کن تھا۔ میں نے ماہین کے تحمل سوالوں کے جواب دیے۔

اسی دوران میں شازمینہ، ماہین کو ڈھونڈتی ہوئی پہنچ

گئی۔ وہ زرش جہاں کی طرح بہت خوب صورت تو نہیں تھی مگر دلکش تھی۔ پھر اس کی عمر بھی زرش سے چار پانچ سال کم تھی۔ اس نے اسکردو سے گریجویشن بھی کر رکھی تھی۔ یہ لوگ جدی پشتی بلتستانی تھے جبکہ پرنس کی موجودہ وائف زرش کی فیملی وادی کیلاش کی طرف سے آئی تھی۔ یہ خالص کیلاش نہیں تھے، کسی شاخ سے تعلق رکھتے تھے۔ زرش جہاں تو پرنس سے شادی کے وقت مسلمان ہوگئی تھی مگر اس کی دبنگ والدہ اندرانا بیگم کے بارے میں کہا جارہا تھا کہ وہ ابھی تک اپنے پرانے مذہب پر ہے۔ اس کی کھردری، سخت طبع کے باعث وہ خاقان ولا میں ایک غیر مقبول ہستی تھی۔

تو میں بات کررہا تھا شازینہ کی۔ وہ بے تکلفی سے میرے اور ماہین کے پاس آن بیٹھی۔ ہلکے سے میک اپ نے اسے نکھار رکھا تھا۔ اس کی سیاہ آنکھوں میں مستقبل کے سہانے سپنوں کی جھلک نظر آتی تھی۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ وہ پرنس بخت کو بہت عزت دیتی ہے اور مستقبل میں خاقان ولا کی بہو بننا اس کے لیے باعث افتخار ہوگا۔ کچھ دیر بعد اچانک ایک شور نے ہمیں چونکا یا۔ یہ شور زنان خانے کی طرف سے اٹھا تھا۔ یوں محسوس ہوا کہ کچھ خواتین بھاگ دوڑ کررہی ہیں مگر یہ ساری ہلچل پریشانی والی نہیں خوشی والی تھی۔ پھر ایسے لگا کہ دو چار پٹاخے بھی چھوڑے گئے ہیں۔ ہم حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر رہائشی حصے (زنان خانے) کی طرف سے کچھ جوان ملازمائیں بھاگتی ہوئی ہماری طرف آئیں۔ ان کے ہاتھوں میں مٹھائی کی تھالیاں تھیں۔ ہیڈ ملازمہ نے ہمیں جھک کر سلام کیا اور چاندی کی تھالی آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”منہ میٹھا کریں جی۔ خوشی کی بات ہے..... خوشی کی بات ہے۔“

”کون سی خوشی؟“ شازینہ نے مٹھائی کا ٹکڑا اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

ملازمہ ذرا شرما کر بولی۔ ”مالک خود بتائیں گے جی..... ابھی بتائیں گے۔“

ماہین اور میں نے بھی مٹھائی کے ٹکڑے اٹھائے۔ ملازمائیں جس طرح بھاگتی ہوئی آئی تھیں اسی طرح واپس چلی گئیں۔

”چلیں آئیں دیکھیں کیا معاملہ ہے۔“ شازینہ نے اٹھلا کر ماہین کا بازو پکڑا اور اسے ساتھ لے کر زنان خانے کی طرف لپک گئی۔

اسی دوران میں عمران بھی میرے کمرے میں آگیا۔

”یہ کیا ماجرا ہے جی؟

”کوئی خوشی والی خبر ہی ہے۔ وہ دیکھو لان میں...... ملازمائیں گلے مل رہی ہیں۔“

قریباً پندرہ منٹ بعد ماہین واپس آئی۔ وہ کچھ خاموش سی تھی۔ ”کیا خبر ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”خبر تو ویسے خوشی کی ہی ہے۔ کہا جارہا ہے کہ بالآخر پرنس کی وائف امید سے ہوگئی ہیں۔ دبی دبی سرگوشیاں کل سے ہی ہورہی تھیں۔ آج میڈیکل رپورٹ بھی آگئی ہے۔ اندرانا بیگم خوشی سے پھولے نہیں سمارہی۔ پورے ولا میں وندناتی پھررہی ہے۔“

”بس یہ اوپر والے کے کام ہیں۔ ہمارے اپنے پروگرام ہوتے ہیں اس کے اپنے فیصلے۔“

پورے ولا میں اور ساری بستی میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی تھی۔ یہ بات اگلے روز تک کنفرم ہوگئی کہ زرش جہاں ”ایکسپیکٹ“ کررہی ہے۔ شام سے کچھ پہلے میں نے پہلی بار زرش جہاں اور پرنس بخت کو اکٹھے دیکھا۔ زرش جہاں ایک بھاری قیمتی شال میں تھی اور پرنس بخت کے ساتھ سرسبز لان میں ٹہل رہی تھی۔ پھر ایک جانب سے تمتماتے ہوئے چہرے والی اندرانا جان اپنے قدرے بھاری جسم کو ہلکورے دیتی ہوئی برآمد ہوئی۔ بیٹی اور داماد سے چند مسکراہٹوں کا تبادلہ کیا، پھر بیٹی کے سر کے اوپر سے کچھ بڑے کرنسی نوٹ وار کر دو ملازماؤں کو دیے اور بیٹی کو احتیاط سے سیڑھیاں چڑھا کر برآمدے میں لے آئی۔ جہاں طویل میز پر چائے کے لوازمات اور مشروبات موجود تھے۔ پرنس بخت بھی زرش کے پہلو میں جا بیٹھا...... اس نے خود جوس کا گلاس بھر کے زرش کے ہاتھ میں تھمایا۔ وہ خاموشی سے سر جھکا کر چسکیاں لینے لگی۔

خاقان ولا کے اندر یہ ایک بہت بڑی تبدیلی رونما ہوئی تھی۔ صرف دو تین روز میں ہی بہت کچھ بدل گیا۔ اس صورت حال نے ماہین کو کچھ غمگین کردیا تھا۔ مجھ سے کہنے لگی۔ انکل! سچی بات یہ ہے کہ آج کل مجھے شازینہ پر بڑا ترس آرہا ہے۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آگئی ہے کہ جس وجہ سے اسے خاقان ولا کی بہو بنایا جانا تھا، وہ وجہ اب ختم ہوگئی ہے۔ وہ کچھ چپ تو ہے مگر اسے قدرت کا فیصلہ سمجھتی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہ بہت جلد اس تبدیلی کو قبول کرلے گی۔“

”اس کے والدین اب شاید یہاں سے جانے کا سوچ رہے ہوں؟“

”ہاں انکل، اندازہ یہی ہورہا ہے کہ اندرانا بیگم اب زیادہ دن شازینہ اور اس کے گھر والوں کو یہاں ٹکنے نہیں

دے گی۔ بہت جہاندیدہ اور چالاک خاتون ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ ایسی صورت حال پیدا کردے گی کہ دو چار دن میں وہ لوگ یہاں سے چلے جائیں۔ اول تو پرنس اُن کے رکنے پر زیادہ زور نہیں دیں گے اور اگر دیں گے بھی تو اندرانا یہ زور چلنے نہیں دے گی۔''

ماہین نے دو چار روز کا کہا تھا مگر دوسرے ہی روز معلوم ہوا کہ شازمینہ اور اس کے والدین خاقان ولا سے جارہے ہیں۔ غالباً اندرونِ خانہ خواتین میں کوئی تلخ کلامی بھی ہوئی تھی جس کے بعد شازمینہ کے والدین نے جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ برف باری کی وجہ سے راستے بند تھے، لہٰذا وہ لوگ اسکردو تو واپس نہیں جاسکتے تھے اس بستی کے اندر ہی شازمینہ کے کوئی خالو بھی رہائش پذیر تھے۔ ان کا گھوڑوں کا فارم تھا۔ شازمینہ کے والدین نے بہانہ بنایا تھا کہ وہ دو چار روز اُن کے پاس رہنا چاہتے ہیں۔ خاقان ولا سے خوش مزاج شازمینہ کی رخصتی کا منظر ہمارے لیے یاس انگیز تھا۔ بظاہر تو وہ مسکرا رہی تھی مگر صاف پتا چلتا تھا کہ اس اچانک روانگی پر وہ اندر سے افسردہ ہے۔ اس کی والدہ بیگم وردا بھی چپ تھیں، شازمینہ، ماہین کے گلے لگی۔ اس کا رخسار چوما اور بھاری دل سے الوداع کہا۔

خوش رنگ شازمینہ کے حوالے سے یہ ایک ٹریجک اینڈ تھا مگر پتا نہیں کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ ابھی اس حوالے سے کچھ مزید ہونا باقی ہے۔ اسی روز مجھے یہ بھی معلوم ہوا کہ بالاٹ والوں سے چند روز پہلے ہونے والی جھڑپ کا معاملہ چونکہ ''سیٹل'' ہوگیا ہے اس لیے طوائف زادی غنچہ اپنے گھر واپس چلی گئی ہے۔

شام کی چائے کے بعد میں اور عمران کمرے میں بیٹھے تھے۔ موضوع وہی پرنس کی وائف کا امید سے ہوجانا تھا۔ عمران بولا۔ ''چاچو! شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اندرانا واقعی چالاک، چالباز عورت ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اُس نے جھوٹ موٹ ہی بیٹی کا پاؤں بھاری ہونے کی افواہ اُڑا دی ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ ہر صورت خاقان ولا میں شازمینہ کا راستہ روکنا چاہتی تھی۔''

''مجھے نہیں لگتا کہ ایسا ہوگا۔ ڈاکٹری رپورٹ کی بات بھی کی جارہی ہے پھر ایسے جھوٹ کو چھپایا کب تک جاسکتا ہے۔''

''دو تین ماہ تو گزارے ہی جاسکتے ہیں۔ بعد میں اابارشن وغیرہ کو ڈھونگ رچایا جاسکتا ہے۔''

''لیکن مجھے نہیں لگتا عمران کہ زرش اس حد تک جاسکتی ہے۔ وہ اپنی ماں سے کافی مختلف ہے۔''

''لیکن ماں کے بہت زیادہ اثر میں بھی تو ہے......''

اسی دوران میں کمرے کا دروازہ کھلا اور ماہین اپنی رو میں تیزی سے اندر آئی۔ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہ رہی تھی...... مگر عمران کو میرے کمرے میں بیٹھے دیکھ کر ایک دم چپ ہوگئی۔ ''اوہ سوری'' کہہ کر واپس چلی گئی۔

عمران کے ساتھ اس کے رویے میں واضح طور پر گریز اور کھچاؤ نظر آرہا تھا۔ عمران نے سر کھجایا اور ٹھنڈی سانس لے کر رہ گیا۔

کچھ دیر بعد عمران اپنے کمرے میں چلا گیا تو میں ماہین کے پاس پہنچا۔ میں نے واضح الفاظ میں اس سے پوچھا کہ وہ عمران کے ساتھ اس قسم کے رویے کا مظاہرہ کیوں کررہی ہے؟

ماہین کی آنکھوں میں گہری سنجیدگی جھلک دکھانے لگی۔ اس نے بے خیالی میں اپنی انگلی میں منگنی کی انگوٹھی کو گھمایا، پھر اپنی حنائی انگلیوں کے ساتھ بالوں کو اپنی پیشانی سے ہٹاتے ہوئے بولی۔ ''انکل تابی! میں سچ کہتی ہوں، میں عمران کی بہت بہت عزت کرتی ہوں اور میں چاہتی ہوں کہ یہ ہمیشہ برقرار رہے۔''

''تو اُس نے ایسی کون سی بات کہہ دی ہے۔''

وہ سر جھکائے جھکائے بولی۔ ''کہنا ضروری تو نہیں ہوتا انکل! اور آپ خود ہی تو کہا کرتے ہیں کہ ایسے معاملوں میں عورت کی حس بہت تیز ہوتی ہے۔ وہ اپنی طرف اٹھنے والی نگاہوں کو پہچان لیتی ہے۔ میں ہرگز ہرگز نہیں چاہتی کہ میرے حوالے سے عمران، خدانخواستہ کسی طرح کی غلط فہمی کا شکار ہوں یا اپنے دل میں کوئی امید پال لیں۔ حقیقت بھی ہے کہ میں حشام سے بہت پیار کرتی ہوں، اس کے علاوہ کسی کے بارے میں سوچنا بھی گناہ لگتا ہے۔''

''واقعی؟'' میں نے اچانک پوچھا۔

اس نے گڑبڑا کر میری طرف دیکھا پھر ہولے سے مسکرا کر اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ کچھ بے چین سی نظر آنے لگی تھی۔ ''اچھا چلو ٹاپک بدلتے ہیں۔'' میں نے کہا اور اس سے زنان خانے کے حالات پوچھنے لگا۔ اس نے بتایا کہ شازمینہ کے جانے کے بعد اندرانا جان اور اس کی حمایتی خواتین بہت خوش ہیں۔ مجموعی طور پر پورے خاقان ولا میں ہی خوشی کی لہر موجود ہے۔ اندرانا بیگم نے ایک لیڈی ڈاکٹر کو مستقل طور پر ولا میں بلا لیا ہے۔ چند روز بعد یہاں ''گود بھرائی'' قسم کی رسم بھی ادا ہونے والی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اندرانا نے اپنی

رہائش گاہ پر کوئی چھوٹی موٹی پوجا بھی کرائی ہے۔

یہ تو ہمیں معلوم ہو چکا تھا کہ زرش مسلمان ہو چکی ہے مگر اندرانا جان کے بارے میں بات گول مول تھی۔ غالباً اس کی عقیدت ابھی تک اپنے پرانے قبائلی مذہب سے تھی۔

میں نے ماہین سے پوچھا۔ "فواد کے بارے میں کچھ سن گن ملی؟ کیا وہ یہاں 'ولا' میں نظر آتا تھا؟"

"جی ہاں، ایک ملازمہ سے صرف اتنا پتا چلا ہے کہ دو تین ماہ پہلے تک اونچے قد کاٹھ والا ایک پنجابی بھی مردانے میں ہوا کرتا تھا۔ وہ شاید ڈرائیور تھا۔ ڈیڑھ دو ماہ بعد چھٹی پر ضرور جایا کرتا تھا مگر اب شاید اس کی پکی چھٹی ہو چکی ہے۔"

"یہ کیا گورکھ دھندا ہے؟ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔" میں نے پیشانی کھجاتے ہوئے کہا۔

"انکل جی! میرا تو خیال ہے کہ ہمیں اس گورکھ دھندے میں زیادہ پڑنا ہی نہیں چاہیے۔ کسی طرح ہم فواد کو یہاں سے نکال لیں، یہی بہت ہے۔"

"ایک پلان تو ہے میرے اور عمران کے ذہن میں۔ لیکن اس کے لیے پرسوں تک انتظار کرنا پڑے گا۔"

"پرسوں کیا ہے؟"

"بلیک آؤٹ۔ دراصل سردیوں میں یہاں بجلی کی روشنی جنریٹرز سے پیدا کی جاتی ہے جو کافی مہنگی ہے۔ گیس کی بھی کمی ہے اس لیے ہفتے میں ایک روز ساری بستی کے جنریٹرز بند رہتے ہیں۔"

ماہین نے تفہیمی انداز میں سر ہلایا پھر بولی۔ "کوئی زیادہ رسک والا کام تو نہیں؟"

"رسک تو اب لینا ہی پڑے گا۔ محترمہ ماہین صاحبہ۔" میں نے کہا اور اسے ضروری تفصیل بتانے لگا۔

☆☆☆

اگر بادل نہ ہوتے تو یہ ایک چاندنی رات ہوتی مگر گھپ اندھیرا تھا۔ اندھیرے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ہفتہ وار بندش کے سبب لائٹس آف تھیں۔ میں اور عمران ایک لوڈر نما طویل جیپ کے پچھلے حصے میں موجود تھے۔ پچھلے چھ سات روز میں ہم نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ یہ لوڈر جیپ روزانہ شام کے بعد خاقان ولا میں آتی ہے۔ اس میں دو تین بکرے، چند مرغیاں اور دودھ کے برتن وغیرہ ہوتے تھے۔ یقیناً یہ سامان خاقان ولا کے وسیع باورچی خانوں میں استعمال ہوتا تھا۔ سامان اتار کر اب لوڈر جیپ واپس جانے والی تھی اور ہم دونوں خاموشی سے پچھلے حصے میں آگئے تھے۔ ہمارے اوپر ترپال تھی جلد ہی ڈرائیور اور اس کا ساتھی سخت سردی میں منہ سے بھاپ اڑاتے ہوئے آئے اور جیپ کے اگلے حصے میں بیٹھ گئے۔ ہماری توقع کے عین مطابق دو منٹ بعد جیپ خاقان ولا سے باہر تھی۔

مقامی ڈرائیور اور اس کا چترالی ساتھی غالباً برانڈی وغیرہ پی رہے تھے اور گپیں بھی ہانک رہے تھے۔ ان کی آوازیں انجن کے شور کے باوجود ہمارے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ وہ پرنس بخت کے وفادار ساتھیوں میں سے تھے۔ پرنس کی تعریفوں میں لگے ہوئے تھے۔ "دیکھ لیا نا، اس منہ پھٹ اندرانا جان کے سارے الزام غلط نکلے۔ اس نے مشہور کر رکھا تھا کہ اولاد نہ ہونے کی وجہ پرنس ہے۔ میری بیٹی بالکل تندرست ہے۔"

"بس یہ خدا کے کام ہوتے ہیں۔" دوسرے شخص نے کہا۔ "کئی دفعہ دس دس سال بعد بھی اوپر والے کا کرم ہو جاتا ہے۔ خوشی بس اس بات کی ہے کہ خدا نے پرنس جی کے گھر میں رونق کی امید لگا دی ہے......"

اب ہم اس پتھریلی عمارت سے زیادہ دور نہیں تھے جہاں چار روز پہلے ہم گھسے تھے اور فواد کو بے بسی کی حالت میں دیکھا تھا۔ ہمارا پروگرام ایک بار پھر اندر گھسنے اور فواد تک پہنچنے کا تھا۔ جونہی چڑھائی پر ایک موڑ کاٹتے ہوئے لوڈر جیپ کی رفتار سست ہوئی ہم احتیاط سے نیچے اتر گئے۔ جیپ برف پوش درختوں میں اوجھل ہوگئی۔ چاروں طرف تاریکی اور سردی کا راج تھا۔ آج تیز برفانی ہوا بھی چل رہی تھی۔ ہم بڑی احتیاط سے عمارت کے بالکل قریب پہنچ گئے۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ ہمارا سارا پروگرام ایکا ایکی تبدیل ہونے والا ہے۔

ابھی ہم عمارت کے عقبی حصے کی طرف بڑھنے کا سوچ ہی رہے تھے کہ عمارت کا گیٹ کھلا اور ہم نے تاریکی میں ایک ڈولی دیکھی جسے دو تنومند کہاروں نے اٹھا رکھا تھا۔ ایسی ڈولیاں ان علاقوں میں عموماً خواتین کی نقل و حرکت کے لیے استعمال کی جاتی ہیں۔ کوٹھی کا گیٹ پھر بند ہو چکا تھا۔ تنومند کہاروں نے اپنے کندھے بدلنے کے لیے لکڑی کی اس ڈولی کو ایک اونچی جگہ پر رکھا اور ایک کہار نے ٹارچ جلائی۔ اس ٹارچ کی روشنی میں مجھے جس شے کی جھلک نظر آئی اس نے مجھے ششدر کر دیا۔ یہ کسی کی ٹانگ تھی جو ڈولی کے دبیز پردوں سے باہر نکلی ہوئی تھی۔ لگتا تھا کہ یہ کوئی زخمی شخص ہے، جو ڈولی میں بیٹھنے کے بجائے لیٹا ہوا ہے اور ٹانگ کو پوری طرح موڑنے سے قاصر ہے۔

چشم زدن میں میرا اور عمران کا دھیان فواد کی طرف

چلا گیا۔ ہم اُسے زخمی ٹانگ کے ساتھ اندرانا کے گھر میں دیکھ چکے تھے۔ کہاروں نے ڈولی کو دوبارہ اٹھایا اور ٹیڑھے میڑھے راستے پر آگے بڑھنے لگے۔ ہمارے پاس اس کے سوا کوئی آپشن نہیں تھا کہ احتیاط سے ڈولی کے پیچھے جائیں۔

دس پندرہ منٹ میں کہار، ڈولی سمیت آبادی سے باہر تھے۔ یہاں چھوٹی بڑی کھائیاں تھیں اور ایک برف پوش ڈھلوان کئی سوفٹ اوپر تک چلی گئی تھی۔ یہاں ضرور کچھ غلط ہونے والا تھا۔ ہماری رگوں میں خون کی گردش تیز ہوگئی۔ وقفے وقفے سے ٹارچ کا روشن دائرہ بھی اپنی چمک دکھا رہا تھا۔ ایک ویران جگہ پر کہاروں نے ڈولی اتار دی۔

ہم جھک کر درختوں میں چلتے ہوئے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔ ڈولی کے اندر سے جو آواز ابھری، وہ صاف ہم تک پہنچی۔ یہ فواد ہی کی آواز تھی۔ وہ جھلائے ہوئے انداز میں بولا تھا۔ ”یہ مجھے کہاں لے آئے ہو، تم تو کچھ اور بتا رہے تھے۔“

جواب دینے کے بجائے ایک تنومند شخص نے زخمی فواد کو بے رحمی سے گھسیٹ کر باہر نکال لیا...... فواد بلند آواز میں احتجاج کرنے لگا۔ تب ٹارچ کے حرکت کرتے ہوئے روشن دائرے نے ایک اور منظر ہماری نگاہوں کے سامنے کیا اور جسم سنسنا اٹھا۔ ایک جگہ بیلچے کی مدد سے برف کو گہرا کھودا گیا تھا اور ایک قبر سی بنا دی گئی تھی...... مجھے یہ بھی اندازہ ہوا کہ یہ دونوں ہٹے کٹے بندے وہی ہیں جو چند روز پہلے اندرانا جان کے ساتھ لاہور پہنچے تھے اور فواد کو اٹھا کر لائے تھے۔ عمران انہیں سینڈو ٹائپ کہتا تھا۔

اچانک ہم نے دیکھا کہ جو شخص زخمی فواد کے عقب میں کھڑا تھا، اس نے اچانک ایک رسی نما چیز، بیٹھے ہوئے فواد کے گلے میں ڈالی اور اس کے گلے کو بے دردی سے بھینچنے لگا۔ فواد چلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا اور بری طرح ہاتھ پاؤں پھینک رہا تھا۔ اب ہم مزید انتظار نہیں کر سکتے تھے۔ ہم اوٹ سے نکل کر لپکے۔ عمران سیدھا اس شخص پر جا پڑا جو موٹی رسی سے فواد کی گردن بھینچ رہا تھا۔ میں پستول نکال کر سیدھا اس دوسرے پر جھپٹا۔ تاہم وہ میری توقع سے زیادہ پھرتیلا نکلا۔ اس کے سر پر کیلاشی طرز کی گول ٹوپی تھی۔ اس نے بڑی تیزی سے ٹانگ چلائی۔ وزنی برفانی بوٹ کی زوردار چوٹ میرے ہاتھ پر لگی اور پستول میری گرفت سے نکل گیا۔ وہ کالے پتھر جیسا شخص نہ صرف مجھ سے آٹکرایا بلکہ اس کا بھرپور گھونسا بھی میرے منہ پر پڑا۔ تاہم اسے پتا نہیں تھا کہ اس وار کا جواب اسے بہت تگڑا ملے گا۔ اس کے دوسرے گھونسے سے بچتے ہوئے میں نے اس کی ناف میں گھٹنا رسید کیا اور چہرے پر سر کی ضرب لگا کر اسے دور پھینک دیا۔ وہ گرتے گرتے اپنی وزنی جیکٹ سے ریوالور نکال چکا تھا۔ اس نے مجھ پر ڈائریکٹ فائر کیا مگر اعشاریہ 38 کی گولی میرے کندھے کے اوپر سے گزر کر سیدھی اس کے ساتھی کے سر میں لگی۔ اس کے دوسرے فائر سے پہلے میں نے اسے دبوچ لیا۔ اس کی توانا گردن میرے بازو کے شکنجے میں تھی۔ بے بس ہونے کے باوجود اس نے اندھادھند زور لگایا۔ وہ اپنے ریوالور کا رخ میری طرف موڑنے کی دیوانہ وار... کوشش بھی کر رہا تھا۔ میں نے اسے روکنے کے لیے گردن پر دباؤ بڑھایا اور گردن کی ہڈی بول گئی۔ اس کا منکا ٹوٹ چکا تھا۔

فواد کی سمجھ میں چونکہ کچھ نہیں آیا تھا لہٰذا وہ اپنی زخمی ٹانگ کے ساتھ موقع سے دور ہٹنا چاہتا تھا۔ عمران نے اسے تھام لیا تھا اور سمجھانے بجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ”مجھے مر جانے دو۔“ فواد بار بار پکارنے لگا۔ تیز ہواؤں میں اس کی آواز ڈوب ابھر رہی تھی۔

اندرانا کے ملازم منڈے ہوئے سروں والے دونوں تنومند شخص برف پر مردہ پڑے تھے۔ ایک کی گردن ٹوٹی ہوئی تھی اور دوسرے کی کھوپڑی سرخ ہو رہی تھی۔ (وہ دونوں کہیں کیلاش کی طرف سے آئے تھے لیکن نسلاً کیلاشی نہیں تھے) ہم جانتے تھے کہ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں۔ ہم نے دونوں کو اس برفانی قبر میں پھینکا جو یقیناً فواد کے لیے کھودی گئی تھی۔ ریوالور، گولیاں اور ٹوپیاں وغیرہ بھی وہیں پھینک دی گئیں۔ برف نرم تھی۔ ہم نے جلدی جلدی بیلچے کی مدد سے قبر بند کر دی۔ موسم خراب ہو رہا تھا۔ برف باری پھر شروع ہوگئی تھی۔ فواد ہذیان بول رہا تھا۔ ”مجھے برباد کر دیا ان لوگوں نے۔ مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ مجھے تم لوگ کوئی آسان موت دے دو۔“

میں نے اسے سمجھایا کہ ہم دشمن نہیں دوست ہیں۔ اس کی مدد کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ہمارے لب و لہجے سے حیران تھا۔ شاید اسے یقین نہیں تھا کہ پنجاب سے کوئی یہاں پہنچ سکتا ہے۔ ہم نے ڈولی کو تو وہیں رہنے دیا اور اسے دونوں طرف سے سہارا دے کر ترائی میں آگے بڑھنے لگے۔ بڑے سائز کی ٹارچ عمران کے ہاتھ میں تھی اور وہ راستہ دیکھنے کے لیے وقفے وقفے سے اسے روشن کر رہا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر چند گھروں کے آثار نظر آئے۔ مجھے یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ یہ وہی چھوٹی سی شانم بستی ہے جس کا ذکر غنچہ نے کیا

تھا۔ ہم چار پانچ منٹ مزید چلے اور بستی کے قریب پہنچ گئے۔ فواد ہذیانی انداز میں بڑبڑایا۔ ”یہاں نہ جانا۔ یہ طوائفوں کی بستی ہے۔ یہ کوئی مدد نہیں کریں گی۔“

تاریکی میں ان پندرہ بیس گھروں کے ہیولے نظر آرہے تھے، مگر مجھے اندازہ ہوا کہ میں نے شانم غنچہ کا گھر پہچان لیا ہے۔ اس نے خود مجھے بتایا تھا کہ بستی میں صرف اسی کا گھر ہے جو ہموار جگہ کے بجائے ڈھلوان پر بنا ہوا ہے۔

میں نے عمران اور فواد کو وہیں برف سے ڈھکے ہوئے درختوں میں چھوڑا اور گھر کے دروازے تک پہنچا۔ ساتھ والے گھر سے کوئی ساز بجنے کی مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔ میری معلومات کے مطابق غنچہ خاقان ولا سے اپنے گھر واپس آچکی تھی۔ دل کڑا کر کے میں نے لکڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ چند سیکنڈ بعد اندر کسی چراغ کی روشنی ہوئی اور پھر دو لڑکیاں میرے سامنے آن کھڑی ہوئیں۔ اُن میں ایک غنچہ تھی۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر وہ ششدر رہ گئی۔ ساتھ والی لڑکی شکل وصورت سے اس کی بڑی بہن لگتی تھی۔ وہ ایک بڑی چادر میں لپٹی ہوئی تھی۔ میں نے غنچہ سے کہا۔ ”تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔ کیا ایک بندے کو ایک رات کے لیے تمہارے گھر میں پناہ مل سکتی ہے؟“

وہ ترنت بولی۔ ”آپ کے لیے تو جان بھی حاضر ہے جی۔ کون بندہ ہے وہ؟“

”جو کوئی بھی ہے مگر شرط یہ ہے کہ یہ سب کچھ راز ہونا چاہیے۔“

اس نے اپنی بہن کی طرف دیکھا۔ ”آپ فکر مند نہ ہوں۔ گھر میں ہم دونوں ہوتے ہیں یا ہماری نانی۔ ان کو بہت کم دکھائی سنائی دیتا ہے۔“ وہ شکستہ اردو میں بول رہی تھی۔

میں واپس گیا اور تھوڑی ہی دیر بعد فواد کے ساتھ لوٹ آیا۔ عمران نے میرے ساتھ مل کر اسے سہارا دے رکھا تھا۔ ہم جلدی سے اندر چلے گئے۔ یہ لکڑی اور پتھر کا بنا ہوا مقامی طرز کا گھر تھا۔ دو تین کمرے تھے اور لکڑی کے ستونوں والا چھوٹا سا برآمدہ تھا۔ کسی کمرے سے عمر رسیدہ عورت کی مدھم کھانسی سنائی دے رہی تھی۔ چراغ کی روشنی میں فواد کو دیکھ کر دونوں لڑکیاں حیران ہوئیں۔ غنچہ بولی۔ ”یہ تو شاید پرنس جی کے ملازموں میں سے تھا؟“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

پانچ دس منٹ بعد ہم فواد کی طرف سے پوری طرح مطمئن ہوگئے۔ غنچہ اور اس کی بہن ہمیں گھر کے چھوٹے سے اسٹور نما کمرے میں لے آئی تھیں اور خالی جگہ پر گدا بچھا کر اس کے لیٹنے کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ غنچہ کا کہنا تھا کہ یہاں یہ بالکل محفوظ رہے گا۔ اگر کوئی اندیشہ ہوتا تو دونوں بہنیں اس اسٹور نما کمرے کو باہر سے تالا لگا سکتی تھیں۔

فواد کا جسم بخار میں تپ رہا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ وہ بہکی بہکی باتیں بھی کر رہا تھا۔ وہ بار بار کہتا تھا...... ”میں نے منت بھی کی تھی، ایسا نہ کرو۔ مجھے کس دلدل میں پھینک دیا۔ نکل سکتا ہوں، نہ مر سکتا ہوں......“

میں نے ذرا سختی سے اسے منع کیا کہ وہ خاموش رہے تو بہتر ہے۔ ورنہ جو لوگ اس کی جان کے درپے ہیں، وہ یہاں بھی پہنچ سکتے ہیں۔

میری بات کسی حد تک اس کی سمجھ میں آگئی۔ عمران نے غنچہ سے پوچھا۔ ”اگر اسے ایک رات سے زیادہ یہاں رکنا پڑا تو رکھ لوگی؟“

غنچہ نے پھر فدا ہو جانے والی نظروں سے میری طرف دیکھا۔ ”یہ جیسا حکم کریں گے ہم ویسا کریں گے۔ آپ بالکل بے فکر رہیں۔“

فواد کے بارے میں غنچہ اور اس کی بہن ایمل کو ضروری ہدایات دے کر ہم واپس خاقان ولا جانے کے لیے باہر نکل آئے۔ خاقان ولا سے زیادہ دیر باہر رہنا ہمارے لیے بہتر نہیں تھا۔ برف باری کے سبب ہڈیوں میں گودا جما جا رہا تھا۔ ہم آدھے راستے میں تھے جب جنگل کی دوسری جانب سے ایک مہیب گونج دار آواز سنائی دی۔ عمران سوالیہ انداز میں میری طرف دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”غالباً کوئی ایوالانچ ہے۔ بہت بڑے ایریا سے برف پھسل کر نیچے آئی ہے۔“

☆☆☆

دوسرے روز دوپہر تک کئی سوال میرے اور عمران کے ذہن میں ابھرتے رہے۔ اندرانا جان نے فواد سے کہا تھا کہ وہ اسے جان کی امان دے چکی ہے لیکن اب اس کی امان کہاں گئی تھی، وہ اسے مار کر گاڑنے کے درپے ہو گئی تھی۔ اگر وہ اسے مارنا ہی چاہتی تھی تو لاہور میں یا راستے میں کہیں کیوں نہ مار دیا؟ فواد بار بار حالات کی کس دلدل کا ذکر کر رہا تھا؟

ہمیں پرنس بخت ہی کی زبانی معلوم ہوا تھا کہ رات کو جو مہیب آواز سنائی دی، وہ ایک بڑی ایوالانچ ہی کی تھی۔ یہ ایوالانچ اسی ایریا میں گری تھی جہاں کل رات دونوں بدمعاشوں کی قبر بنی تھی۔ یہ ایک موافق صورتِ حال تھی۔

امید کی جا سکتی تھی کہ وہ قبر اور لکڑی کی ڈولی وغیرہ سب کچھ برف کے ریلے میں دفن ہو گیا ہوگا۔

دوپہر کے وقت برف باری کچھ ہلکی ہوئی تو پرنس اپنے کسی کام سے خاقان ولا سے روانہ ہوا۔ وہ جب بھی نکلتا تھا پوری سیکیورٹی کے ساتھ نکلتا تھا۔ کم از کم چار گاڑیاں ہوتی تھیں۔ ان گاڑیوں میں درجن بھر مسلح گارڈز ہوتے تھے۔ پرنس کی اپنی لینڈ روور جیپ میں بھی گارڈز موجود رہتے تھے۔

یہاں بھیڑوں اور پہاڑی بکریوں کے بڑے بڑے باڑے تھے جو خاقان فیملی کی ملکیت تھے۔ اس کے علاوہ کھالوں کا کاروبار بھی تھا۔ یہ علاقہ کافی بلندی پر تھا، پھر بھی گرم موسم میں یہاں ترائی کی طرف کھیتی باڑی ہوتی تھی اور چند باغات بھی تھے۔ جنگل کی کٹائی سے بھی لوگوں کو آمدن ہوتی تھی۔

پرنس کے جانے کے بعد ہمیں مناسب لگا کہ باہر نکلیں اور فواد کی خیر خبر لیں۔ میں نے ماہین کو اس ساری سنسنی خیز صورتِ حال سے آگاہ کیا اور ہم فواد سے ملنے چل پڑے۔ ماہین اور عمران میں بات چیت کم ہی ہوتی تھی۔ عمران ظاہر نہیں کرتا تھا اور اس صورتِ حال کو ہلکے پھلکے انداز میں لے رہا تھا لیکن میں جانتا تھا کہ ماہین کے حوالے سے اس کے دل پر گہری چوٹ لگی ہے...... برف باری کے سبب طوائفوں کی بستی آج بھی سنسان ہی نظر آتی تھی۔ لوگ گھروں میں بند تھے۔ میں نے کل ہی غنچہ کو بتا دیا تھا کہ ہم دوپہر کے بعد آئیں گے۔ وہ الرٹ تھی۔ لہٰذا میری ہلکی سی دستک پر ہی فوراً دروازہ کھل گیا۔ غنچہ کی شکل سے ہی اندازہ ہو گیا کہ سب خیریت ہے۔ (غنچہ کی بڑی بہن کو بچہ ہونے والا تھا اس لیے وہ چادر میں لپٹی نظر آتی تھی)

ہم عقبی اسٹور روم نما کمرے میں پہنچے۔ فواد کے قریب کھانے پینے کی اشیا رکھی تھیں مگر اس نے کسی چیز کو چھوا تک نہیں تھا۔ اس کا بخار برقرار تھا۔ میں نے اسے جگایا اور ہم نے اسے زبردستی گڑ والے دلیے کے چند لقمے کھلائے۔ وہ ایک گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھا ہوا تھا اور بار بار اپنا سر بے قراری میں ہلاتا تھا۔ آج اس کمرے میں چھوٹا سا زرد بلب روشن تھا۔ ایک چھوٹی سی انگیٹھی نے کمرے کو قدرے گرم کر رکھا تھا۔ باہر برف بہت خاموشی اور تسلسل سے گر رہی تھی۔

میں نے اور عمران نے بڑے طریقے سے فواد کو اپنے ڈھب پر لانا شروع کیا۔ یہ کوشش طویل تھی مگر دھیرے دھیرے کامیابی کی طرف بڑھنے لگی۔ یہ جان کر کہ ہم لاہور میں اس کی دکھیاری ماں اور کم سن بیٹی سے مل چکے ہیں اور صرف...... صرف اس کی مدد کے لیے یہاں سیکڑوں میل دور آئے ہیں تو وہ حیران اور متاثر نظر آنے لگا مگر یہاں کے حالات کے بارے میں وہ کچھ بھی بتانے کو تیار نہیں تھا۔

میں نے کہا۔ ”دیکھو فواد، تم یہاں جس جال میں پھنسے ہوئے ہو، اس میں سے ہم تمہیں تب ہی نکال سکتے ہیں جب ہمیں پوری صورتِ حال کا پتا چلے گا۔“

”آپ لوگوں سے کس نے کہا ہے کہ میں یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔ میں تو بس...... اس زندگی سے چھٹکارا چاہتا ہوں اور اگر یہ چھٹکارا اس کی نظروں کے سامنے ملے تو شاید جان آسانی سے نکل جائے۔“ وہ کراہا۔

”کس کی نظروں کے سامنے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ ایک دم گڑبڑا گیا۔ جیسے وہ بات کہہ دی ہو جو کہنا نہ چاہتا ہو۔ بخار نے جیسے اس کا دماغ ماؤف کر رکھا تھا۔ اس نے آنکھیں بند کر لیں۔

میں نے موضوع بدلا۔ ”اچھا اتنا بتا دو۔ یہاں کے پرنس بخت سے تمہارا کیا تعلق ہے۔ ہمیں لگتا ہے کہ تمہارا قد کاٹھ، تمہاری آنکھوں کا رنگ اور تمہارے نقش کچھ نہ کچھ پرنس سے ملتے ہیں۔“

”کاش یہ نقش نہ ملتے۔“ وہ پھر کراہ اٹھا۔ ”یہی سب کچھ ہے جو مجھے اس حالت تک لایا ہے۔“

”یعنی اپنی شکل وصورت کی وجہ سے تم کو یہاں ملازم رکھا گیا؟“ عمران دور کی کوڑی لے آیا۔

”یہ بھی کہہ سکتے ہو مگر اصل زور تو میری بدقسمتی نے ہی مارا جو میں یہاں پہنچا۔“

”اچھا، تمہاری ڈیوٹی کیا تھی یہاں؟“

وہ طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”یہی کہ اگر کوئی گولی پرنس صاحب کے سینے کی طرف آئے تو اسے اپنے سینے پر لوں۔“

وہ اب کچھ کچھ کھل رہا تھا۔ اس حوالے سے اس نے ہمیں مزید جو کچھ بتایا، وہ ہماری توقعات سے بالکل ہٹ کر تھا۔ فواد کی زبانی جو کچھ معلوم ہوا وہ مختصراً یوں تھا۔ کوئی دو سال پہلے لاہور کے بس اڈے پر پرنس بخت کے ایک دوست کی نظر اتفاقاً فواد پر پڑی اور وہ یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ فواد ساٹھ ستر فیصد تک پرنس سے ملتا جلتا ہے۔ اس کا حتمی نتیجہ یہ نکلا کہ پرنس کے اس دوست نے لاہور میں فواد کا اتا پتا معلوم کیا اور پھر آناً فاناً اسے ایک بڑی اچھی نوکری کی آفر کر دی گئی۔ شروع میں اسے یہی بتایا گیا کہ اسے ایبٹ آباد جانا ہوگا مگر بعد میں یہ راز کھلا کہ اسے ایبٹ آباد سے بہت آگے مانشر

بروم پہاڑ کے نواح میں جانا ہے۔ بہر حال ملازمت دینے والوں نے فواد کو سختی سے منع کر دیا کہ وہ اپنی جائے ملازمت کے بارے میں کسی کو کچھ نہیں بتائے گا۔ ملازمت کی نوعیت کا اندازہ بہ آسانی لگایا جا سکتا ہے۔ یہاں بالاٹ والوں سے پرنس کی پرانی دشمنی چل رہی تھی۔ آئے روز ایک دوسرے پر گولیاں بھی چل جاتی تھیں۔ فواد کو یہاں بظاہر بطور جیپ ڈرائیور رکھا گیا تھا مگر خاقان ولا کے خاص لوگ جانتے تھے کہ وہ کبھی کبھی نقلی پرنس کے روپ میں پرنس کی گاڑی میں سفر بھی کرتا ہے۔ وہ سب کچھ سیکیورٹی کے نقطۂ نظر سے ہوتا تھا یا مخالف پارٹی کو چکما دینے کے لیے۔

ہمارے لیے یہ سب انکشاف انگیز تھا۔ مگر یہ بات ہمارے لیے ابھی تک معما تھی کہ اندرانا جان اس طرح ہاتھ دھو کر فواد کے پیچھے کیوں پڑی ہوئی تھی۔ اسے کیوں یہاں لائی تھی اور کیوں شانم لڑکیوں کے ذریعے اسے بہلانے کی کوششیں کرتی تھی۔ اصل بات فواد ابھی تک نہیں بتا رہا تھا مگر یہ خوش آئند تھا کہ وہ ہم پر بھروسا کرنا شروع ہو گیا ہے۔ اس کے ساتھ گفتگو بہت طویل ثابت ہوئی۔ پھر ایک موقع ایسا آیا کہ ہمارے مسلسل سوالات سے گھبرا کر وہ ''ہائپر'' ہو گیا۔ زمین پر مکے برسانے لگا اور چلّانے لگا۔ عمران نے اپنی ہتھیلی سے اس کا منہ ڈھانپ دیا۔ وہ دہاڑیں مار مار کر رونے لگا اور گدے پر گر گیا۔ کروٹیں بدلنے لگا۔ بخار کی شدت سے اس کا چہرہ دہک رہا تھا مگر پھر یہ ہوا کہ اس پُرآشوب ہیجانی کیفیت کے بعد اس کے اندر کی کچھ گرہیں جیسے کھل سی گئیں۔ میں گدے پر آلتی پالتی مارے بیٹھا تھا، فواد کا سر میرے زانو پر تھا اور میں اپنے زانو پر اس کے آنسوؤں کی نمی محسوس کر رہا تھا۔

وہ جیسے بخار کی مدہوشی میں کراہا۔ ''انسان کے اندر کی نفرت اور ضد اسے کہاں سے کہاں پہنچا دیتی ہے۔ یہ اندرانا جان بھی بے غیرتی کی حد تک گر چکی ہے۔ وہ کسی بھی طرح...... کسی بھی طرح ان لوگوں کو نیچا دکھانا چاہتی تھی۔ اس نے میرے ساتھ اور شاید...... اپنی بیٹی کے ساتھ بھی ایسا ظلم کیا جس کا کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔''

''وہ کن لوگوں کو نیچا دکھانا چاہتی تھی؟'' عمران نے استفسار کیا۔

''وہی بی بی شازمینہ اور اس کے گھر والے...... جن کے ساتھ پرنس کی تیملی رشتہ جوڑنا چاہ رہی تھی۔'' وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔

اگلے دس پندرہ منٹ میں فواد نے جو کچھ ہمیں بتایا وہ ناقابلِ یقین تھا۔ اس نے رونگٹے کھڑے کر دیے۔ دل و دماغ قبول ہی نہیں کر رہے تھے کہ کوئی عورت اپنی ضد، انا اور نفرت میں اتنا آگے بھی جا سکتی ہے۔ ہم پر بہت بھروسا کرنے کے باوجود شاید فواد ہمیں یہ سب نہ بتاتا مگر وہ تیز بخار کی عجیب سی خود فراموشی میں تھا۔ اس نے مجھ سے اور عمران سے رازداری کی قسمیں اٹھوانے کے بعد بہکے سے لہجے میں یہ انکشاف کیا کہ پرنس بخت کی بیوی زرش جہاں سے اس کے قربت کے تعلقات تھے۔ یہ تعلقات از خود نہیں بنے تھے بلکہ بنائے گئے تھے...... اور انہیں بنانے والا کوئی اور نہیں خود زرش کی سگی ماں، اندرانا تھی۔ وہ پرنس کی ہونے والی منگیتر، شازمینہ اور اس کی والدہ وردا بیگم سے دشمنی میں اتنا آگے بڑھ چکی تھی کہ بس اندھی ہو کر رہ گئی تھی۔ اسے پتا تھا کہ پرنس کی دوسری شادی کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ بے اولاد ہے۔ اندرانا کو یہ بھی گمان تھا کہ شاید بے اولادی کی اصل وجہ پرنس بخت ہی ہے۔ ان سارے حالات کے پیشِ نظر اس نے ایک ایسا قدم اٹھایا جو ناقابلِ یقین تھا۔ اس نے اپنی بیٹی زرش کو مجبور کیا کہ وہ پرنس بخت کے لیے بچہ پیدا کرے بے شک یہ بچہ کسی اور کا ہی کیوں نہ ہو۔ زرش خود بُری نہیں تھی لیکن اپنی ماں کے بے حد اثر میں تھی۔ وہی ماں جس کے اندر قدیم قبائلی عداوت پرستی انوکھی شکل میں موجود تھی۔ اس نے زرش کو مجبور کر دیا کہ وہ فواد کے ساتھ تعلق پیدا کرے۔ فواد کے انتخاب میں ایک ''رمز'' یہ بھی تھا کہ اس کی مشابہت کسی نہ کسی حد تک پرنس سے ملتی تھی۔ اس کی آنکھیں بھی گہری بادامی تھیں۔ عیار اندرانا کے ذہن میں یہ بات بھی موجود تھی کہ جب زرش کا بچہ پیدا ہوگا تو کوئی سوچ بھی نہ سکے گا کہ یہ پرنس بخت کا نہیں ہے۔

لیکن یہاں ایک اور صورتِ حال سامنے آ گئی۔ ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ ایک ارادہ انسان کا ہوتا ہے ایک اوپر والے کا۔ منصوبہ ساز نے کچھ اور سوچا ہوتا ہے اور نتیجہ کسی اور طرف نکل جاتا ہے۔ یہاں جو کچھ ہوا، وہ فواد ہی کی زبانی سنیے۔

وہ اشک بار لہجے میں بول رہا تھا۔ ''اندرانا بیگم جو کچھ کہہ رہی تھی، میں ہرگز اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ میں نے اس کی منت کی، ہاتھ تک جوڑے۔ وہ پہلے لالچ دیتی رہی۔ اس نے مجھے سونے اور کیش کی شکل میں ٹھیک ٹھاک رقم دینے کا کہا اور وعدہ کیا کہ وہ ایبٹ آباد میں رہنے والے اپنے ایک عزیز سے کہہ کر مجھے باہر کے ملک بھجوا دے گی جہاں میں بعد میں اپنے گھر والوں کو بھی بلا سکوں گا۔ میں انکار کرتا رہا تو وہ دھمکیوں اور ڈراووں پر اتر آئی۔ میں نے اس سے کہا...... یہ

بڑا جرم ہوگا۔ پرنس میرے ٹکڑے کر کے کتوں کے آگے ڈال دیں گے۔'' چند لمحے توقف کر کے فواد نے بات جاری رکھی۔ ''اندرانا بیگم اپنے مذہب کے مطابق کسی سوریزان دیوتا کی پجارن ہے۔ اس پر بے پناہ یقین رکھتی ہے۔ ایک روز اماوس کی رات میں سوریزان کے بت کے سامنے اس نے اپنی ایک انگلی پر چیرا دے کر اپنا خون اپنے ماتھے پر لگایا اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ وہ مجھے کچھ نہیں ہونے دے گی۔ کانٹا چبھنے کی تکلیف بھی نہ پہنچنے دے گی۔ ہر طرح میری حفاظت کرے گی۔ اس نے زرش کو میکے یعنی اپنی کوٹھی پر بلالیا۔ انہی دنوں اس نے اپنی نیلی گاڑی چلانے کے لیے مجھے پرنس سے ادھار بھی لے لیا تھا۔ ایک رات اس نے مجھے اور زرش کو ایک ہی کمرے میں سونے پر مجبور کر دیا۔ یہ سلسلہ شروع ہوا تو پھر لمبا ہوتا چلا گیا۔ ہر دوسرے تیسرے روز اندرانا بڑی ہوشیاری سے مجھے زرش کے کمرے میں بھیج دیتی تھی۔ یہ جو کچھ ہو رہا تھا، مجھے پسند نہیں تھا مگر میں اس میں گم ہوتا چلا جا رہا تھا۔''

فواد نے چند لمحے توقف کر کے کانپتے ہاتھوں سے پانی کے چند گھونٹ لیے اور بات جاری رکھتے ہوئے بولا۔ ''میرے اور زرش کے درمیان عورت مرد والا تعلق قائم ہو چکا تھا۔ مجھے یہ ماننے میں عار نہیں کہ زرش خوب صورتی کے لحاظ سے ہزاروں میں ایک ہے۔ وہ خود کو ہوشیار، چالاک بھی سمجھتی ہوگی مگر اپنی ماں کے مقابلے میں بہت سادہ ہے۔ اس پر ماں کا کچھ ایسا اثر ہے کہ وہ اس کے حکم سے باہر نہیں جا سکتی...... دو تین ہفتے بعد مجھے محسوس ہونے لگا کہ میرا دل و دماغ میرا ساتھ نہیں دے رہا۔ میں بڑی بے چینی سے دن کے گزرنے اور رات کو زرش سے ملاقات کا انتظار کرنے لگا تھا...... دوسری طرف ایک عجیب بات اور ہو رہی تھی۔ شاید آپ لوگ میری اس بات پر پوری طرح یقین نہ کریں مگر یہ حقیقت ہے کہ زرش کو بھی میرا انتظار رہتا تھا۔ ملاقات کی رات ہم صبح تک ایک دوسرے میں گم رہتے اور پھر بھاری دل کے ساتھ خود کو ایک دوجے سے جدا کرتے۔ مجھے یوں لگنے لگا تھا کہ زرش کو پرنس جی سے وہ محبت چاہت کبھی نہیں ملی جس کی اُسے ضرورت تھی۔''

گزرے دنوں کو یاد کرتے ہوئے فواد کی بادامی آنکھوں میں نمی سی چمکنے لگی تھی۔ بات کو آگے بڑھاتے ہوئے وہ بولا۔ ''انہی دنوں میں پرنس جی کو آٹھ دس دنوں کے لیے میری ضرورت پڑ گئی۔ میں ان کی گاڑی چلا کر اسکردو لے گیا۔ واپس آ کر جب میں اندرانا جان کی کوٹھی پر پہنچا تو اس نے مجھے زرش سے ملنے نہیں دیا۔ اس نے بتایا کہ زرش کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے اطلاع دی کہ میری ڈیوٹی اب ختم ہے۔ ہمارے درمیان جو طے ہوا تھا، اس کے مطابق اندرانا نے 24 قیراط کا سونا مجھے دیا، بازار میں اس کی قیمت بارہ لاکھ سے کم نہیں تھی۔ اس کے علاوہ کچھ نقد رقم بھی دی اور کہا کہ اب میں یہ سب کچھ بھول جاؤں۔ سمجھوں کہ کبھی کچھ ایسا ہوا ہی نہیں۔ پروگرام کے مطابق مجھے ایک ڈیڑھ ماہ کے اندر کسی بھی بہانے سے پرنس کی نوکری چھوڑ کر واپس لاہور چلے جانا تھا۔

دو ماہ پہلے یہ سب کچھ بہت آسان لگ رہا تھا لیکن اب مجھے یہ لگا کہ یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا۔ جوں جوں میں نے اس بارے میں سوچا، مجھے یہ دنیا کا مشکل ترین کام محسوس ہوا۔ زرش سے میری آخری ملاقات بھی نہ ہو پائی تھی ورنہ شاید میں اُس سے اپنے دل کا حال بیان کرتا۔ اسے بتاتا کہ اس کی والدہ کی ضد کی وجہ سے کن زنجیروں میں جکڑا گیا ہوں۔ میں خاقان ولا واپس تو چلا گیا لیکن میرا دل و دماغ روح سب کچھ اسی کمرے میں رہ گیا جہاں میں نے زرش کے ساتھ کچھ راتیں بسر کی تھیں۔''

عمران اور میں حیرت میں ڈوبے ہوئے فواد کی ہوش رُبا رُوداد سن رہے تھے۔ وہ یقیناً ان مردوں میں تھا جو گھاٹ گھاٹ کا پانی نہیں پیتے...... جس پانی سے اُن کی پیاس بجھتی ہے اور روح سیراب ہوتی ہے، وہ اسی پانی کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فواد کی پہلی بیوی شادی کے صرف ڈیڑھ سال بعد ہی فوت ہو گئی تھی۔ اس کے بعد فواد کی زندگی میں کوئی عورت نہیں آئی تھی۔ اب قریباً چھ سال بعد ایک عورت آئی تھی اور ایسے انوکھے انداز میں کہ وہ خود بھی ورطۂ حیرت میں تھا۔

غنچہ نے اس مختصر کمرے میں گرم قہوہ پہنچا دیا تھا اور انگیٹھی میں کچھ کوئلے ڈال دیے تھے۔ باہر برف باری جاری تھی۔ فواد کی باتوں سے پتا چلا کہ خاقان ولا واپس آنے کے بعد وہ کوشش کے باوجود زرش اور اس کی قربت کو دل و دماغ سے نکال نہیں پایا۔ جب تڑپ حد سے بڑھ گئی تو وہ حشیش کا نشہ کرنے لگا۔ وہ زرش کی ایک جھلک کو ترستا تھا مگر وہ تو سات پردوں میں چھپ چکی تھی۔ وہ بیمار ہو گیا جو کھاتا پیتا تھا الٹ دیتا تھا۔ اس کی مسلسل نشے بازی کی خبر پرنس تک پہنچی تو ایک دو وارننگز کے بعد انہوں نے اسے ملازمت سے فارغ کر دیا۔ ایک رات وہ روتا بلکتا اندرانا جان کی رہائش گاہ پر پہنچا۔ تنہائی میں اُس سے ملا۔ اندرانا سے کہا کہ اس نے اسے کس عذاب میں ڈال دیا ہے۔ وہ جی سکتا ہے نہ مر سکتا ہے۔

وہ ایک بار...... ایک آخری بار اسے زرش جہاں سے ملا دے۔ جہاندیدہ اندرانا سمجھ گئی کہ یہ بات کسی اور طرف چل نکلی ہے۔ ممکن ہے اس کے دماغ میں یہ بھی آیا ہو کہ وہ فواد کو مروا دے۔ مگر وہ سوریزان دیوتا کی پجارن تھی اور اس نے اپنے عقیدے کے مطابق بہت بڑی قسم کھا رکھی تھی کہ فواد کی جان کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی اور نہ پہنچنے دے گی۔ اس نے فواد کو تسلی دی اور اس سے کہا کہ وہ اس کے لیے کچھ نہ کچھ کرے گی (اس کے دماغ میں غالباً یہی چل رہا تھا کہ فواد کو جوانی اور عشق کا بخار چڑھا ہوا ہے۔ اور وہ کسی نہ کسی طور اس بخار کو اتار لے گی)

دوسری طرف فواد شدید ترین ڈپریشن کا شکار ہو کر لاہور واپس چلا گیا۔ اس کی حالت ایسے شخص کی تھی جو کانٹوں پر لوٹ رہا ہو، شاید اس کے ذہن کے کسی گوشے میں تھوڑا بہت یہ اندیشہ بھی تھا کہ کہیں اسے مروا نہ دیا جائے۔

اس کے لاہور جانے کے بعد جہاندیدہ اندرانا کو ایک اور طرح کا خدشہ لاحق ہو گیا۔ وہ جانتی تھی کہ فواد کی ذہنی حالت دگرگوں ہے۔ وہ نشہ بھی کر رہا ہے۔ اپنی ہیجانی کیفیت میں وہ اُن راتوں کا بھید کھول دیتا جو اس نے زرش کے ساتھ گزاری تھیں تو قیامت آجاتی۔ بنا بنایا کھیل بگڑ جاتا۔ (زرش امید سے ہو چکی تھی مگر ابھی اندرانا نے یہ بات راز رکھی ہوئی تھی) وہ اپنے دو خاص ملازموں کے ساتھ طویل سفر کر کے ماشبر بروم کے دامن سے لاہور پہنچی اور فواد کو مختلف حیلے بہانوں سے بہلا پھسلا کر بڑی رازداری سے یہاں لے آئی۔ اس کے بعد کے واقعات ہمیں معلوم ہی تھے۔

دوا کھانے سے فواد کا بخار کچھ ہلکا ہو گیا تھا مگر سردی کے سبب زخمی پنڈلی میں درد موجود تھا۔ پنڈلی کے بارے میں فواد نے بتایا تھا کہ چند روز پہلے اندرانا کی ویران رہائش گاہ پر پڑے پڑے اس کا دم گھٹنے لگا تھا اس نے ایک کھڑکی کی جالی اکھاڑ کر وہاں سے نکلنے کی کوشش کی مگر اندرانا کے دونوں ملازموں نے اسے پکڑ لیا اور مار پیٹ کر دوبارہ بند کر دیا۔ یہ چوٹ اسی واقعے کی نشانی تھی۔

عمران نے فواد سے پوچھا۔ ”کیا پھر کبھی دوبارہ زرش جہاں سے تمہارا سامنا ہوا؟“

”نہیں۔“ اس نے دکھ کے عالم میں سر ہلایا۔

”تمہارا کیا خیال ہے، وہ تمہارے بارے میں کیا سوچتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”مم...... میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ جب اس کی ماں نے ہم دونوں کو ایک راستے پر ڈال دیا...... تو پھر وہ چل پڑی...... وہ...... میرا انتظار کرتی تھی۔ مجھے لگتا ہے کہ اس کی زندگی میں کچھ کمی تھی۔ لیکن ان محرومیوں کا اظہار اس نے مجھ سے کبھی نہیں کیا۔ تنہائی اور پاس ہونے کے لمحوں میں وہ بالکل خاموش اور بے حرکت سی ہو جاتی تھی۔ جیسے اس صورتِ حال کے لیے خود پر کوئی بوجھ یا الزام نہ لینا چاہتی ہو۔ مگر یہ سب کچھ اسے...... بُرا...... بالکل...... نہیں لگتا تھا۔“

”اچھا...... کل رات کیا ہوا تھا...... جو اندرانا کے بندوں نے تمہیں مارنے کا فیصلہ کر لیا؟“

”مجھے کچھ پتا نہیں۔ اس نے قسم کھا رکھی تھی لیکن ایسی عورت کا کیا بھروسا، کیا پتا کس بہانے اس نے اپنی قسم توڑ دی۔ اندرانا نے مجھ پر یہی ظاہر کیا تھا جیسے وہ میرا دکھ دیکھ کر اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور ہو گئی ہے اور مجھے کم از کم ایک بار اپنی بیٹی سے ملانا چاہتی ہے۔ اس نے کہا کہ شام کے بعد اس کے دونوں خاص ملازم مجھے ایک ڈولی میں بٹھا کر ایک گھر میں چھوڑ کر آئیں گے۔ بعد میں وہاں زرش جہاں بھی پہنچے گی اور مجھ سے ملاقات کرے گی...... لیکن جو کچھ ہوا، وہ آپ لوگوں نے دیکھا ہی ہے۔ اگر آپ دونوں نہ آتے تو شاید میں اب برف کی قبر میں ہوتا۔“ اس کی سرخ آنکھوں میں نمی آگئی۔

عمران ...... گہری سانس لے کر بولا۔ ”یہ تو ہمیں اندازہ ہو گیا تھا کہ اندرانا ایک سخت مزاج عورت ہے...... اور شازینہ کی ماں ہے، خاقان ولا میں اس کی چپقلش چل رہی ہے مگر وہ اس لڑائی میں اور اپنی ضد میں اتنا آگے چلی جائے گی، اس کا نہیں سوچا تھا۔“

”تم نے ایک انوکھی کہانی سنائی ہے فواد۔“ میں نے کہا۔ ”رشتوں کی لڑائی میں کچھ عورتیں کتنی پستی میں جا گرتی ہیں اس کا پتا آج چلا ہے۔“

مجھے اور عمران کو اندازہ ہو گیا تھا کہ غنچہ اور ایمل کے گھر کے اس عقبی کمرے میں دو چار دن تک فواد بالکل محفوظ ہے۔ ہم اس کے حوالے سے اپنا آئندہ لائحہ عمل سوچ سکتے تھے۔ فواد کو خدشہ تھا کہ اپنے دو خاص کارندوں کی گمشدگی اندرانا جان کو بہت بے چین کر دے گی اور وہ ان کی تلاش میں بہت آگے تک بھی جا سکتی ہے مگر صرف پندرہ بیس منٹ بعد ہمیں پتا چل گیا کہ فواد کا خدشہ اتنا درست نہیں ہے۔ جب ہم فواد اور غنچہ کو ضروری ہدایات دینے کے بعد اس گھر سے نکلے تو اس مقام پر سے بھی گزرے جہاں قریباً 20 گھنٹے قبل اندرانا کے دو خاص کارندوں کی قبر بنی تھی۔ وہ سارا ایریا اب پہچانا ہی نہیں جا رہا تھا۔ کئی درخت بھی ناپید تھے۔ ایوالانچ

کی ہزاروں ٹن برف نے سب کچھ اپنے نیچے گہرائی میں دفن کرلیا تھا...... تلاش میں ناکامی کے بعد اندرانا یہ سوچ سکتی تھی کہ اس کے دونوں قاتل ہرکارے بھی لکڑی کی ڈولی سمیت برف میں دفن ہوئے ہیں، اب ان کی لاشیں کسی گرم موسم میں ہی دریافت ہوسکتی ہیں۔ برف پوش بلندیاں ایسے ہی حیران کن واقعات کو جنم دیتی ہیں۔

☆☆☆

صرف دو روز بعد خاقان ولا میں جشن کا سماں تھا۔ لائٹس لگائی گئی تھیں۔ محرابی دروازوں اور دالانوں میں گیس کے رنگ برنگے ہنڈولے جھول رہے تھے۔ شام سے ہی رنگین آنچل لہرانے شروع ہوگئے تھے۔ معزز مہمانوں میں زیادہ تر عورتیں اور بچے ہی تھے۔ درجنوں ہی بکرے ذبح کیے گئے تھے اور بھنے ہوئے گوشت اور قیمے کی خوشبو ٹھٹھری ہوئی فضا میں تیر رہی تھی۔ مردانے کی جانب کوئی بہت بڑا ڈھول پیٹا جارہا تھا اور نفیریاں اور بگل بج رہے تھے۔ ہم نے دیکھا قیمتی لباس میں ملبوس تنومند اندرانا جان، ولا کے طول وعرض میں دندناتی پھر رہی تھی اور کیوں نہ پھرتی اس کی بیٹی خاقان ولا کو بچے کی خوشی دینے والی تھی...... اور کیا پتا یہ نرینہ اولاد ہوتی اور خاقان ولا کو وارث مل جاتا۔

یہ سوچ کر دکھ ہوا کہ جو بچہ اس دنیا میں آنے والا ہے، اس کا اصل ''باپ'' چند فرلانگ دور ایک چھوٹے سے گھر کے نیم تاریک کمرے میں کمبل اوڑھے لیٹا ہے اور اپنے دل کے روگ کا ناقابلِ برداشت درد جھیل رہا ہے۔ کسی نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے اس پر ایک ''عنایت'' کی تھی اور وہ دیوانہ عنایت کے اس تیر سے گھائل ہوکر عشق کا مریض بن گیا تھا۔

گود بھرائی کی یہ رسم زنان خانے میں ادا کی جارہی تھی، تاہم ماہین نے اپنے اسمارٹ فون پر اس کے کچھ کلپ بنالیے اور ہمیں دکھائے۔ پرنس بخت، اپنی بجی سنوری بیوی زرش جہاں کے پہلو میں بیٹھا تھا۔ وہ خوش نظر آرہا تھا۔ لمبی نازک گردن والی زرش جہاں بھی گا ہے بگا ہے مسکرا رہی تھی۔ تنومند اندرانا بیٹی پر صدقے واری جانے کے لیے اس کے اردگرد موجود تھی۔ مہمان خواتین میں مجھے کہیں بھی شازمینہ یا اس کے گھر والے نظر نہیں آئے حالانکہ وہ ابھی ''ذخیرے'' میں ہی موجود تھے۔ میں نے ماہین سے پوچھا کہ وہ کیوں نہیں آئے؟

ماہین نے کہا۔ ''وہ آئے ہوئے ہیں لیکن شاید کسی کونے میں بیٹھے ہوں گے، وڈیو میں نہیں آئے۔ پرنس بڑے وضع دار شخص ہیں۔ بے شک یہ رشتے والی بات اب ختم ہوگئی ہے لیکن وہ خود گئے تھے اور بڑے اصرار کے ساتھ ان لوگوں کو ولا میں لے کر آئے ہیں۔ شازمینہ بھی صاف شفاف اور کھلے دل کی مالک ہے جو آگئی ہے۔ اس سچویشن کی وجہ سے اندرانا کے سینے پر ضرور مونگ دلی جارہی ہوگی۔''

زنان خانے میں تقریب جاری تھی۔ میں نے وڈیو کلپ میں ایک بار پھر غور سے خوبرو زرش کو دیکھا۔ وہ پرنس کے پہلو میں مسکرا تو رہی تھی مگر نجانے کیوں مجھے لگا کہ اس کی مسکراہٹ کے پیچھے ایک کھوکھلا پن سا ہے۔ اب پتا نہیں کہ یہ میرا وہم تھا یا حقیقت تھی...... پرنس کے بیمار والد بھی ایک ایزی چیئر پر نیم دراز تھے اور خوش نظر آنے کی کوشش کررہے تھے۔ اس بھری پُری محفل میں کون جانتا تھا کہ جس بچے کے آنے کی خوشی منائی جارہی ہے، وہ بچہ پرنس بخت کا ہے ہی نہیں۔ وہ بچہ اس گناہ کی کوکھ سے جنم لے گا جس کے تانے بانے پرنس کی عیار ساس نے بُنے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی انا اور نفرت کے دوش پر سوار ہوکر بہت دور تک چلے جاتے ہیں۔

آخرت میں تو جو ہونا ہے، وہ ہوگا ہی لیکن گناہ دنیا میں بھی اپنا نتیجہ ظاہر کرکے رہتا ہے۔ اس خاقان ولا میں بھی عنقریب ایک تہلکہ سا مچنے والا تھا۔ آتشدانوں، انگیٹھیوں، لذیذ کھانوں اور سُریلے لوک گیتوں سے سجی ہوئی یہ محفل آخر اختتام پذیر ہوئی۔ معزز مہمان رخصت ہونے لگے۔ مہمان خانے کی کھڑکی میں سے میں نے شازمینہ اور اس کے والدین کو بھی رخصت ہوتے دیکھا۔ پرنس خود انہیں گاڑی تک چھوڑنے آیا۔ شازمینہ کے ساتھ پرنس کا کوئی ''محبت'' وغیرہ کا معاملہ نہیں تھا۔ اگر یہ شادی ہوتی تو یقیناً ارینج میرج کے زمرے میں ہی آتی۔ تاہم قرائن سے اندازہ ہوتا تھا کہ ولا میں اپنے قیام کے دوران میں شازمینہ ضرور پرنس میں کچھ نہ کچھ دلچسپی لینے لگی تھی۔ یقیناً پرنس تھا ہی چاہے جانے کے قابل۔

تقریب ختم ہونے کے بعد شازمینہ اور اُس کے والدین کے چہرے پر گہری سنجیدگی نظر آنے لگی تھی۔

میں نے کہا۔ ''عمران! مجھے لگتا ہے کہ برف کی وجہ سے اگر راستے بند نہ ہوگئے ہوتے تو شاید شازمینہ اور اس کے گھر والے ایک دن بھی یہاں نہ رکتے۔''

''اور میں کہاں رکتا۔'' عمران ترنت بولا۔ ''کب کا لاہور پہنچ گیا ہوتا۔''

میں نے کہا۔ ''تمہیں اگر جانا ہوتا تو اس طرح بن

بلائے مہمان کی طرح لاہور سے آ تے ہی نا۔ سچ بات یہی ہے کہ تم نے ساتھ آ کر ماہین کو پریشان کر دیا ہے۔ وہ سوچتی ہے کہ اگر حسام کو پتا چل گیا کہ تم بھی اس ٹور میں ہمارے ساتھ تھے تو وہ بہت ناراض ہوگا۔ بہتر ہے کہ اب یہ بات راز ہی رہے۔"

"آپ بے فکر رہیں، میں اس بات کو اپنی محبت کے ساتھ اپنے سینے میں دفن کرلوں گا اور اوپر پکی اینٹوں کی قبر بنوا کر ماربل لکوا دوں گا...... اور پھر انڈیا چلا جاؤں گا۔"

"اب پہلے یہاں سے نکلو گے تو انڈیا جاؤ گے نا۔ ہمیں یہاں تیرہ چودہ روز ہو چکے ہیں۔ ماہین کو پریشانی یہ ہے کہ پیچھے کوئی اطلاع نہیں۔ یہی پریشانی مجھے بھی ہے مگر...... بہر حال وہ ایک لڑکی ہے۔"

وہ بولا۔ "والد محترم کی وصیت کے مطابق لوگوں کے دکھ دور کرنے کے لیے ہی تو میں اس دنیا میں آیا ہوں۔ لیکن کیا کروں؟ بقول مشہور شاعر احمد رشدی...... ہم تو مائل بہ کرم لیکن مسائل ہی نہیں۔"

"یہ مفکر پاکستان علامہ اقبال کا مصرعہ ہے۔ ہم تو مائل بہ کرم ہیں کوئی سائل ہی نہیں۔"

اس نے بتیسی نکالی۔ "میں صرف یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ آپ کو کچھ آتا جاتا بھی ہے یا نہیں...... باقی جہاں تک ماہین کی پریشانی کا ذکر ہے، اس کا ایک حل ہے میرے پاس...... ذرا کان اِدھر کریں۔"

اس نے رازداری کے انداز میں مجھے بتایا کہ کل اس نے دیکھا تھا، پرنس بخت کے پاس سیٹلائٹ فون ہے۔ اس خاص فون کے ذریعے ماہین اور میں اپنی خیر خیریت کی اطلاع پہنچا سکتے ہیں۔ عمران کی یہ اطلاع بڑی سود مند ثابت ہوئی۔ اگلے روز میں نے اشارتاً پرنس سے اپنی پریشانی کا ذکر کیا اور وہ اثبات میں سر ہلا کر اندر چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ باہر آیا تو اس کے ہاتھ میں سیٹلائٹ فون تھا۔ میرا اور ماہین کا مسئلہ حل ہو گیا۔

اسی روز سرِ شام ایک عجیب ہنگامہ ہوا۔ پہلے تو رہائشی حصے کی طرف سے کسی کے بلند آواز میں بولنے کی آوازیں آتی رہیں پھر ایک دو چھناکے ہوئے، جیسے کسی نے طیش کے عالم میں کسی کھڑکی کے شیشے توڑے ہوں۔ تب عورتوں کے بولنے کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ ان میں سے ایک بھاری آواز میں نے اور عمران نے صاف پہچانی۔ یہ پرنس کی ساس اندرانا جان تھی۔ وہ کسی سے جھگڑ رہی تھی۔ ہمارے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ وہ کس سے جھگڑ رہی ہے۔ اس بات کا پتا دس پندرہ سیکنڈ بعد چلا جب پرنس بخت طیش کے عالم میں زنان خانے سے نکلا۔ اس کے ایک ہاتھ میں اپنی بیوی زرش کی کلائی تھی۔ وہ اسے کھینچتا ہوا سا باہر لا رہا تھا۔ ہماری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ نہایت شائستہ اور مہذب پرنس بخت ایسی حالت میں نظر آئے گا۔

ہٹی کٹی اندرانا جان، پرنس کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ پرنس نے اسے دھکیل کر دور ہٹا دیا۔ اس کی گونجتی ہوئی آواز ہمارے کانوں تک پہنچی۔ "تمہیں کوئی گنجائش نہیں ہے...... اب کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ا۔۔ اب جانا ہوگا۔" وہ بلتی زبان میں بولا۔

"بخت آور! تمہیں بتانا ہوگا...... بات کیا ہے؟" اندرانا چلائی۔

"بات اس سے پوچھ لینا۔" پرنس نے ترنت جواب دیا۔ اور کھینچ کر اسے لان کی دو تین سیڑھیاں اتارنے لگا۔ سیڑھیاں اترتے اترتے اس کا پاؤں رپٹا اور وہ گرتے گرتے بچی۔ اندرانا گرج کر بولی۔ "ہوش کرو بخت آور۔ تمہیں پتا نہیں یہ کس حالت میں ہے؟"

"پتا ہے کس حالت میں ہے۔" پرنس اس سے بھی اونچی آواز میں بولا اور زرش کو اس کی ماں کی طرف دھکیلا۔ ... اندرانا نے اسے بازوؤں میں لیا۔ وہ سراپا غیظ و غضب نظر آنے لگی تھی۔ "یہ اچھا نہیں کر رہے ہو بخت آور...... تمہیں اس کا جواب دینا پڑے گا۔"

"مجھے کوئی جواب نہیں دینا۔" وہ آتشیں لہجے میں پھنکارا۔ "جو جواب دینے ہیں اسی نے دینے ہیں۔"

اندرانا نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا مگر پرنس اپنے گارڈز کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ "یہ دونوں چلی جائیں تو ولا کے گیٹ بند کر دینا۔" وہ دندناتا ہوا سا اندرونی حصے میں واپس چلا گیا۔ ولا کی خواتین اور ملازمائیں کھڑکیوں میں سے یہ حیران کن تماشا دیکھ رہی تھیں۔ کچھ ہی دیر بعد اندرانا اپنی اشک بار بیٹی کو بازوؤں میں لے کر کسی تند بگولے کی طرح ولا سے باہر چلی گئی۔ اس کی خاص ملازمہ بھی ساتھ تھی۔ اندرانا بلند آواز میں کچھ کہتی بھی جا رہی تھی مگر آواز ہمارے کانوں تک نہیں پہنچ سکی۔

شام کے بعد میں اور عمران کمرے میں بیٹھے تھے۔ آتش دان میں لکڑیاں چڑچڑا رہی تھیں۔ ہم اسی تحیر خیز صورت حال پر تبصرہ کر رہے تھے۔ میں نے کچھ دیر پہلے ماہین سے بھی پوچھا تھا لیکن وہ بھی لاعلم تھی کہ اچانک یہ

"دھماکا"! کیسے ہوا ہے؟

عمران اپنی کنپٹی کھجاتے ہوئے بولا: "چاچو جان! پچانوے فیصد بلکہ ننانوے فیصد امکان تو اسی بات کا ہے، کسی طرح پرنس کو پتا چل گیا ہے کہ اس کی بیوی صاحبہ کا پاؤں کیوں اور کیسے بھاری ہوا ہے۔"

"لیکن پتا کیسے چلا۔ یہ بھی سوچنے والی بات ہے اور دوسری سوچنے والی بات یہ ہے کہ فواد کی جان کو اب دہرا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ اگر پرنس کو یہ بھی پتا چل گیا ہے کہ زرش کے حاملہ ہونے کا اصل ذمے دار کون ہے تو وہ فواد کی جان لے سکتا ہے۔"

"آپ کا اندیشہ درست ہے...... مگر فی الحال تو کسی کو کانوں کان خبر نہیں کہ فواد یہیں موجود ہے۔ خاقان ولا کے مکینوں کی معلومات کے مطابق وہ یہاں سے پنجاب واپس جا چکا ہے۔"

"بہرطور، اب ہمیں اس کی طرف سے مزید محتاط رہنا پڑے گا۔"

"آپ کا کیا خیال ہے، زرش اور اس کی ماں اب کہاں گئی ہوں گی؟"

"کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ فی الحال تو راستے ہی بند ہیں۔ ویسے یہ لوگ کہیں کیلاش کی جانب سے نقل مکانی کر کے یہاں آئے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ راستے کھلنے کے بعد وہیں چلے جائیں۔ فی الوقت وہ ذخیرے سے باہر کہیں پناہ لے سکتے ہیں۔"

موسم ٹھیک تھا۔ میں نے اور عمران نے مناسب سمجھا کہ ایک بار فواد سے ملا جائے اور غنچہ کے گھر میں اس کی حفاظت کو یقینی بنایا جائے یا پھر اسے وہاں سے کسی طرح شفٹ کر دیا جائے۔

چہل قدمی کے بہانے ہم دونوں ولا سے نکل گئے۔ سورج، برف پوش مغربی چوٹیوں کے عقب میں اوجھل ہو چکا تھا، تاہم تاریکی پوری طرح نہیں پھیلی تھی۔ ہم چیڑ اور اخروٹ کے گنجان درختوں میں سے گزر رہے تھے جب اچانک مجھے اپنے عقب سے ایک مشکوک اور تیز چاپ سنائی دی۔ میرا ہاتھ بے ساختہ اپنے پستول کی طرف بڑھا لیکن اس سے پہلے کہ میں پستول پوری طرح جیکٹ کی جیب سے نکال پاتا، کوئی شخص ایک چنگھاڑ کے ساتھ مجھ پر حملہ آور ہوا۔ حملہ بالکل غیر متوقع تھا، میں سنبھل نہ سکا اور پشت کے بل ایک تناور درخت سے ٹکرایا۔ مجھے اپنے فن حرب پر مان اور اعتماد تھا مگر چند سیکنڈ میں میرا اعتماد نصف سے بھی کم رہ گیا۔ نوجوان حملہ آور نے اتنی تیزی اور سفاکی سے وار کیے کہ میں چکرا گیا۔ میرے سنبھلتے سنبھلتے اس نے اپنا کوئی ایک فٹ لمبا تیز دھار چھرا میرے سینے پر چلایا۔ مجھے اپنا بچاؤ کرنے میں سیکنڈ کے دسویں حصے کی بھی دیر ہوتی تو کام تمام ہو جاتا۔ پھر بھی چھرا دستے تک میرے دائیں بازو میں گھس گیا۔ وار میں اتنی طاقت تھی کہ موٹی جیکٹ کے باوجود وہ میری کہنی سے تھوڑا اوپر آر پار ہو گیا۔ میں نے حملہ آور کے سینے پر زوردار ٹانگ رسید کر کے اسے خود سے دور ہٹایا، وہ اپنے خون آلود چھرے سمیت کمر کے بل ایک پتھر سے ٹکرایا۔ ایسے لگا جیسے پتھر سے کوئی پتھر ہی ٹکرایا ہے۔ وہ وحشی انداز میں پکار رہا تھا۔ "مار چھوڑوں گا تجھے، ٹکڑے کر دوں گا۔ تو نے عالم خان سے ٹکر لی ہے......" اس کی سانس گاڑھی بھاپ کی صورت نکل رہی تھی، جیسے اس کے سینے میں لگی ہوئی آگ کا دھواں ہو۔

بے شک یہی وہ شخص تھا جس کی ساری آن بان اور دہشت میرے یہاں آتے ساتھ ہی غارت ہو گئی تھی۔ بالاٹ کا یہ بدمعاش اب سراپا غضب تھا۔ میرے زخمی بازو سے خون کی پچکاری سی نکلی تھی۔ میں بازو پکڑ کر تکلیف سے دہرا ہو گیا۔ یہی لگا جیسے ہڈی بھی کٹ کر رہ گئی ہے۔ بہت چوٹیں کھائی تھیں، بہت زخم سہے تھے مگر اس زخم نے جسم میں درد کی ایک ایسی لہر پیدا کی جو میرے جیسے ڈھیٹ کے لیے بھی ناقابلِ برداشت تھی۔ سمجھ میں نہیں آیا، یہ کیا ہوا ہے۔

اب عمران سنبھل گیا تھا۔ مجھے زخمی دیکھ کر وہ دیوانہ وار حملہ آور پر جھپٹا۔ اپنے چہرے پر اس کے مہلک چھرے کا وار بچا کر اس نے اپنی سیدھی ٹانگ اس کے جبڑے پر رسید کی اور پھر اس سے لپٹ گیا۔ عمران ٹھیک ٹھاک مار اماری کر لیتا تھا مگر اس مار اماری کا "لیول" ابھی وہ نہیں تھا جو عالم خان جیسے کسی وحشی لڑاکے کے سامنے ہونا چاہیے۔ پھر بھی میرے شدید زخمی ہونے کے خیال نے اس کے دماغ میں چنگاریاں سی بھر دی تھیں، وہ بڑی شدت کے ساتھ حملہ آور سے بھڑ گیا تھا۔ اب میں نے بھی بائیں ہاتھ سے پستول نکال لیا تھا مگر وہ دونوں اس طرح گتھم گتھا تھے کہ میں فائر نہیں کر سکتا تھا۔ حملہ آور نے چوٹیں کھانے کے باوجود چھرا ابھی اپنے ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا اور یہ بڑی سنگین بات تھی۔ اچانک درختوں سے ابھرنے والی آوازوں نے مجھے چونکایا، یہ آوازیں آبادی کی طرف سے ہی آ رہی تھیں۔

برف پوش پہاڑوں میں گھری داستان کے
مزید سنسنی خیز واقعات اگلے ماہ پڑھیں

طاہر جاوید مغل

بظاہر زندگی کی روش آسان نظر آتی ہے... مگر راستے ہمیشہ ہموار نہیں رہتے... ماہ و سال آسانی سے نہیں گزرتے... واقعات کی گردش ہو یا پھر کوئی سانحہ، دل کو ہلا دیتا ہے... یہ درد و غم برف کے مانند پگھلتے نہیں... بلکہ پتھر کی طرح دل پر نقش ہو جاتے ہیں... ایک ایسی ہی داستانِ تحیر... جس کے کردار پیش منظر میں رہتے ہوئے بھی پس منظر کا حصہ تھے... انہیں جاننے کے لیے ماضی کے جھرونکوں سے آگاہی ضروری تھی... برف پوش وادیوں میں کھو جانے والے کرداروں کی تلاش کا سلسلہ... اسرار کے پردوں میں چھپی سازشیں جو بلند و بالا قلعے کی دیواروں سے روزن تلاش کررہی تھیں... دو دلوں کے بیچ ہوش مندوں نے ہمیشہ رکاوٹیں کھڑی کی ہیں... مگر جب عشق جنوں کی سرحدوں میں داخل ہو جائے تو پھر کوئی رکاوٹ... رکاوٹ نہیں رہتی... قدم قدم پر ایک نئے جہاں سے متعارف کراتی سنسنی خیز داستان...

فطرت و جذبات میں قیامت مچا دینے والی تلخیوں کا رقصِ حقیقت

تب میں نے درختوں میں ٹارچوں کی روشنی دیکھی، اور اس کے ساتھ ہی بگل کی آوازیں سنائی دیں۔ یہ پرنس کے محافظ تھے اور ان کے ساتھ کچھ عام لوگ بھی تھے۔ یہ منظر دیکھ کر عالم خان نے اچانک عمران کے پیٹ میں ٹانگ رسید کی۔ عمران نشیب میں لڑھکا، عالم خان اندھا دھند دوسری طرف بھاگا۔ سامنے سے ایک شخص نے اسے پکڑنے کی کوشش کی اور یہ اس شخص کی بدقسمتی ثابت ہوئی۔ عالم خان نے تیز دھار چھرا چلایا اور اس شخص کو ڈھیر کرتا ہوا درختوں میں اوجھل ہو گیا۔ میرے قیافے کے مطابق عالم خان کی عمر بمشکل اکیس بائیس سال رہی ہوگی۔ اس کے وحشی جسم میں بلا کی تیزی طراری تھی۔ ٹارچ بردار محافظ اس کے پیچھے لپکے۔ تین چار گھڑسواروں نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ کچھ افراد میری طرف آئے اور میرا زخم دیکھنے لگے۔ عمران اٹھ کر اس شخص کی طرف گیا جسے عالم خان جاتے جاتے گھائل کر گیا تھا۔ ٹارچ کی روشنی میں اس بے چارے کی انتڑیاں پیٹ سے لٹکتی ہوئی نظر آئیں۔ سفید برف پر خون کی سرخی پھیل رہی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے چند سیکنڈ میں اس نے دم توڑ دیا۔

عمران میری طرف بڑھا۔ ”چاچو! آپ ٹھیک ہیں نا؟“ اس نے ایک چھوٹی ٹارچ کی روشنی میرے بازو پر ڈالی۔

میں نے جیکٹ اتار دی تھی۔ سبز وردی والے ایک محافظ نے میری آستین چڑھائی۔ زخم بازو پر کندھے اور کہنی کے درمیان آیا تھا۔ یہ کوئی چار انچ چوڑا زخم تھا جو آر پار ہو گیا تھا۔ بظاہر یہ تیز دھار آلے کا زخم تھا۔ ایسے زخم شروع میں بہت تکلیف نہیں دیتے، مگر نجانے کیوں مجھے شدید درد محسوس ہو رہا تھا۔

ظاہر ہے، اب طوائف زادی غنچہ کی طرف جانا تو میرے اور عمران کے لیے ممکن نہیں تھا، ہم پرنس کے محافظوں کے ساتھ واپس خاقان ولا آ گئے۔ مجھ پر حملے کی خبر بڑی تیزی سے خاقان ولا میں اور ارد گرد پھیل گئی۔ یہ حملہ یوں کچھ اور سنگین ہو گیا تھا کہ عالم خان کے ہاتھوں ایک شخص کی جان بھی چلی گئی تھی۔

ولا میں موجود ڈاکٹر عظیم فوراً میری مرہم پٹی کے لیے پہنچ گیا۔ پرنس بخت کو خبر ملی تو وہ بھی بھاگا ہوا آیا۔ ''تابش صاحب! آپ ٹھیک ہیں نا؟'' میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بھی میرا زخم دیکھنے لگا۔ اس کی آنکھوں میں سرخی دوڑ گئی تھی۔ ''مجھے ان کمبختوں کی طرف سے پہلے ہی اس طرح کا اندیشہ تھا۔'' وہ دانت پیس کر بولا۔ پھر اپنے انچارج محافظ طالب شاہ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ''طالب! کچھ پتا چلا اس کا؟''

''نہیں مالک...... نکل گیا ہے خبیث کا بچہ۔''

''جا کر گھس گیا ہو گا اپنے اس باپ شنگرے خاناں کی گود میں۔'' پرنس نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ''مگر اب میں چھوڑوں گا نہیں۔ اس کی سزا مل کر رہے گی اسے اور شنگرے خاناں کو۔''

اسی دوران میں میرے زخم کو صاف کرتے کرتے ڈاکٹر عظیم نے پرنس بخت آور کو کوئی اشارہ کیا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔ پرنس بھی اس کے پیچھے گیا۔ ایک دو منٹ بعد دونوں واپس آئے اور ڈاکٹر عظیم پھر میرے زخم کی مرہم پٹی میں مصروف ہو گیا۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر عظیم نے پرنس سے میرے زخم کے بارے میں ہی کوئی بات کہی ہے۔

ذخیرہ نام کی اس پوری آبادی میں شدید اضطراب پایا جا رہا تھا۔ عالم خان نے بڑی دیدہ دلیری سے ذخیرے کی حدود میں گھس کر نہ صرف مجھے نشانہ بنایا تھا بلکہ ایک شخص کو جان سے مار ڈالا تھا۔

میں اور عمران مہمان خانے میں اپنے کمرے کے اندر پہنچے تو ماہین بھی وہیں آ گئی۔ مجھ پر ہونے والے حملے کی وجہ سے وہ بھی ازحد پریشان تھی۔ اس کا رنگ سفید ہو رہا تھا۔ کہنے لگی۔ ''انکل تابش! مجھے لگ رہا ہے کہ یہ بات یہیں ختم نہیں ہو گی۔ پرنس اور ان کے ساتھیوں میں سخت غصہ پایا جا رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ دو چار گھنٹوں کے اندر یہ کوئی جوابی کارروائی کریں۔''

''یہ تو پھر مزید خون خرابا ہو گا۔'' میں نے کہا۔

ماہین بولی۔ ''اندر بڑے خاقان جی کی طبیعت بھی ایک دو دن سے زیادہ خراب ہے۔ اگر یہاں کوئی ٹین شین والا کام ہوا تو شاید وہ سہہ نہ سکیں۔ ان سے ہر بات چھپائی جا رہی ہے۔ ابھی شام سے پہلے پرنس اور ان کی بیگم زرش جہاں میں جو سخت لڑائی ہوئی ہے، اس کی خبر بھی ان تک نہیں پہنچائی گئی لیکن اس نئے واقعے کی وجہ سے اگر یہاں گولیاں وغیرہ چل گئیں تو پھر تو ان کو پتا چلے گا ہی۔''

کچھ ہی دیر بعد میں خاقان ولا کے وسیع ڈرائنگ روم میں پرنس بخت کے پاس موجود تھا۔ میرے بازو سے درد کی شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں مگر ان کی پروا کیے بغیر میں یہاں آ گیا تھا۔ پرنس کے ایک باریش چچا اور کچھ چچازاد اور دو پھوپی زاد کزن بھی یہاں موجود تھے۔ انچارج گارڈ طالب شاہ بھی تھا۔ درحقیقت طالب شاہ کی حیثیت یہاں ایکشن کمانڈر کی سی تھی۔ سب کے چہروں کے اتار چڑھاؤ سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بالاٹ والوں کو اس جارحیت کا قرار واقعی جواب دینا چاہتے ہیں۔ تاہم ان میں دو چار ایسے بھی تھے جو فوری کارروائی کے حق میں نہیں تھے اور پرنس بخت کو ذرا تحمل کا مشورہ دے رہے تھے۔ ان میں پرنس کے چچا بھی شامل تھے۔ وہاں پرنس کی گفتگو سے مجھے پتا چلا کہ پرنس کو بے شک اپنے ایک بندے کی ہلاکت کا دکھ بھی ہے مگر زیادہ غم و غصہ اسے اس بات کا ہے کہ اس کے مہمان یعنی مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا۔

وہاں کچھ دیر گفتگو جاری رہی، پھر پرنس کے چچا عبدالرحمان نماز کے لیے چلے گئے تو میں نے پرنس سے درخواست کی اور اسے دوسرے کمرے میں لے آیا۔ میں نے کہا۔ ''پرنس، میں آپ کے جذبات کی قدر کرتا ہوں لیکن میرا مشورہ بھی یہی ہے کہ کسی فوری جوابی کارروائی سے گریز کیا جائے۔ اس وقت وہ لوگ پوری تیاری میں ہوں گے۔ اگر آپ نے انہیں کوئی جواب دینا ہی ہے تو پھر آپ ایسے وقت کا انتخاب کریں جو آپ کے لیے سود مند ہو۔''

مجھے فوری طور پر محسوس ہوا کہ میری اس دلیل نے پرنس بخت پر اثر کیا ہے۔ میں نے مزید کہا۔ ''آپ کو یہ بھی دیکھنا ہو گا کہ بڑے خاقان کی حالت تشویشناک ہے، ڈاکٹر انہیں سنبھالنے کی پوری کوشش کر رہے ہیں۔ ایسے وقت میں اگر

یہاں صورتِ حال کشیدہ ہو جاتی ہے تو اس کا اثر براہ راست بڑے خاقان جی پر پڑے گا۔ اگر خدانخواستہ انہیں کچھ ہوا تو......'' میں نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

پرنس اب واضح طور پر سوچ بچار کرتا ہوا نظر آ رہا تھا۔ اپنے چچا عبدالرحمان کی رائے بھی یقیناً اس کے سامنے تھی۔ پرنس کے ساتھ میری گفتگو کچھ دیر مزید ہوئی اور پھر مجھے محسوس ہونے لگا کہ کسی فوری کارروائی کا خطرہ ٹل گیا ہے...... اور اب بات شاید پنچایت کی طرف جائے گی۔

☆☆☆

فوری لڑائی وغیرہ کا خطرہ ٹل گیا تھا مگر خاقان ولا میں عجیب سی بے چینی پائی جاتی تھی۔ اس بے چینی کی وجہ وہی پرنس اور زرش جہاں کا ازدواجی معاملہ تھا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر ان دونوں میں کیا مسئلہ ہوا کہ فقط دو دن پہلے ''ولا'' میں گود بھرائی کا جشن منانے والی اندرانا بیگم اور اس کی بیٹی اب ''ولا'' میں نظر ہی نہیں آ رہی تھیں۔ ہاں یہ راز ولا کے مکینوں کو معلوم نہیں تھا لیکن ہمیں معلوم تھا، ہم جو یہاں کے رہنے والے نہیں تھے۔ ''آؤٹ سائیڈر'' تھے لیکن یہاں کے مکینوں سے کہیں زیادہ جان چکے تھے۔

دو روز بعد ماہین کی زبانی مجھے معلوم ہوا کہ پرنس اور اس کے دوسرے چچا سلیمان خان خود چل کر شازمینہ اور اس کے والدین سے ملنے گئے ہیں۔ راستے مسدود ہونے کی وجہ سے شازمینہ اور اس کے والدین ابھی یہاں ذخیرے میں ہی اپنے ایک عزیز کے ہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ ماہین نے بتایا کہ پرنس چاہتے ہیں، شازمینہ اور وردا خانم وغیرہ ولا میں واپس آ جائیں۔

''پھر کیا نتیجہ نکلا؟''

''وہ نہیں مانیں۔ ان کا کہنا غالباً یہی ہے کہ موجودہ حالات میں ان کا دوبارہ یہاں آنا نہیں بنتا۔ یقیناً ان کو یہ الجھن بھی ہوگی کہ آناً فاناً پرنس اور زرش جہاں کے درمیان ایسا کیا ہوا ہے کہ زرش اور اس کی ماں کو ولا سے ہی نکلنا پڑ گیا ہے۔''

''تمہارے خیال میں آئندہ کیا ہو سکتا ہے؟'' میں نے ماہین سے پوچھا۔

''میرا اندازہ ہے کہ پرنس دوبارہ شازمینہ اور وردا خانم کے پاس جائیں گے اور انہیں ولا میں لانے کی کوشش کریں گے۔ پرنس کو یہ احساس ہے کہ عیار اندرانا بیگم کی وجہ سے شازمینہ اور اس کے گھر والوں کے ساتھ زیادتی ہوئی ہے۔''

ماہین نے چند لمحے توقف کیا اور پھر میری طرف دیکھ کر مسکرائی۔ اس کے گال کا ڈمپل نمایاں نظر آنے لگا۔ ''اور انکل

''یہ جاسوسی ناول مصنف نے واقعی نئے انداز میں لکھا ہے۔ اس میں قاتل آخر میں وہی نکلتا ہے جس پر آپ کو شروع سے شک ہوتا ہے۔''

جان! اب اس بلیٹن کی سب سے اہم اور دھانسو خبر آپ کے لیے...... ذرا توجہ مرکوز کریں۔''

''اس وقت تو واقعی کسی دبنگ سوشل میڈیا چینل کی رپورٹر لگ رہی ہو۔''

وہ رازداری کے انداز میں بولی۔ ''زرش اور اس کی والدہ اندرانا کو یہاں سے دیس نکالا تو مل چکا ہے لیکن آخری خبریں آنے تک وہ اپنی اسی رہائش گاہ میں ہیں جہاں کچھ دن پہلے تک انہوں نے فواد کو بند رکھا ہوا تھا۔ میں تصور کی نظر سے دیکھ سکتی ہوں کہ اس عمارت میں اب رونا دھونا مچا ہوگا۔''

''کون رو رہا ہوگا؟''

''وہی زرش اور اس کی زندگی تباہ کرنے والی اس کی ماں اندرانا جان۔'' ماہین نے کہا اور پھر ذرا توقف کر کے ٹھہرے ہوئے انداز میں بولی۔ ''تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ پرنس نے زرش جہاں کو باقاعدہ طلاق دے دی ہے۔''

یہ واقعی دھماکا خیز اطلاع تھی اور ایک طرح سے یہ اس بات کا بین ثبوت بھی تھا کہ پرنس اس گناہ سے آگاہ ہو چکا ہے جو چالباز اندرانا نے اپنی بیٹی سے کروایا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو آناً فاناً یوں طلاق کی نوبت کیوں آتی۔

یہاں اس ذخیرہ نامی خوب صورت بستی میں واقعات اب تیزی سے رونما ہو رہے تھے۔ دو روز کے وقفے کے بعد ہلکی برف باری پھر شروع ہو گئی تھی۔ حسبِ سابق سہ پہر کے وقت میں اور عمران پھر رازداری کے ساتھ غنچہ کے گھر پہنچے۔ ہم نے ہڈ والی جیکٹس پہن رکھی تھیں اور مفلر وغیرہ لپیٹ رکھے تھے۔ کوئی ہمیں غنچہ کے الگ تھلگ گھر میں داخل ہوتے دیکھ بھی لیتا تو پہچان نہ سکتا۔ غنچہ ہمیشہ کی طرح مسکراتے چہرے کے ساتھ ملی اور ہمیں یقین ہو گیا کہ یہاں سب خیریت ہے۔ فواد کا بخار اب اتر چکا تھا اور وہ پہلے سے بہتر نظر آتا تھا۔ مجھ پر ہونے والے حملے کی خبر یہاں تک بھی پہنچ چکی تھی۔ غنچہ کے علاوہ فواد نے بھی دردمندی کے ساتھ میری خیریت دریافت کی۔ خاص طور سے غنچہ زیادہ فکرمند نظر آتی تھی۔ ٹین ایجرز والی شدید جذباتیت اس میں موجود تھی۔

فواد ہم سے اندرانا بیگم اور زرش وغیرہ کے حالات جاننا چاہتا تھا۔ اس حوالے سے ہمارے پاس اہم ترین خبر موجود تھی مگر فی الحال ہم نے اسے اوپن کرنا مناسب نہیں سمجھا اور فواد کو صرف اتنا ہی بتایا کہ پرنس اور اس کی بیوی کے درمیان کچھ ناچاقی پائی جا رہی ہے۔ فواد کی حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔ شاید وہ کئی ہفتوں سے نہیں نہایا تھا۔ لباس بھی بدلے جانے کی ضرورت تھی۔ عمران نے اصرار کر کے اسے گرم پانی سے نہانے پر آمادہ کیا۔ وہ اسے سہارا دے کر غسل خانے میں لے گیا۔ گھر میں آج اضافی خاموشی تھی۔ غنچہ نے بتایا کہ اس کی بہن ایمل دایہ کو دکھانے کے لیے کسی قریبی گھر میں گئی ہے اور نانی سو رہی ہے۔ کمرے کی تنہائی میں غنچہ کا چہرہ ایک دم تمتمانے لگا تھا۔ وہ معمولی شکل و صورت کی تھی مگر اس کا سانچے میں ڈھلا ہوا جسم غیر معمولی تھا۔ وہ ایک منقش صراحی میں شراب لے آئی اور بڑے اطمینان سے میرے سامنے رکھتے ہوئے بولی۔ ”آپ پئیں گے؟ یہ ”مقدس“ شراب ہے۔ کیلاش میں تہواروں پر پی جاتی ہے۔“

”یہ کیوں پلا رہی ہو مجھے؟“ میں نے ناگواری سے کہا۔

”کہتے ہیں کہ اس سے مرد عورت کے درمیان جھجک دور ہو جاتی ہے۔“ اس نے شکستہ اردو میں کہا اور کمال بے تکلفی سے میرے پہلو میں بیٹھ کر اپنا سر میرے کندھے سے لگا دیا۔ اس کا پیکر آگ کی طرح دہکنے لگا تھا۔

”اچھا کھڑی ہو جاؤ۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

وہ میرے سامنے کھڑی ہو گئی اور اپنے لباس کی سلوٹیں درست کرنے لگی۔ اس نے شاید یہ سمجھا تھا کہ میں اسے اپنے سامنے کھڑا کر کے اس کے ہوش ربا جسم کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔

”اٹھاؤ یہ صراحی اور وہیں رکھ کر آؤ جہاں سے لائی ہو۔“

وہ ذرا ٹھٹک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ اسی دوران میں عمران باتھ روم کی طرف سے تولیا لینے کے لیے نکلا۔ اس نے غنچہ کو مخاطب کر کے ہانک لگائی۔ ”کمرے میں جلدی سے انگیٹھی گرم کر دو۔“

عمران کو آتے دیکھ کر غنچہ نے جلدی سے صراحی اٹھائی اور غڑاپ سے دوسرے کمرے میں اوجھل ہو گئی۔ میں اس کے لیے شدید جھلاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ میں نے کوئی ہیرو بننے کے شوق میں اسے جھڑپ کے دوران میں نہیں بچایا تھا۔ وہاں کوئی بھی اس صورتِ حال سے دوچار ہوتا تو میں یہی کرتا۔ اب وہ ٹین ایجرز والے دیوانے پن کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ مجھے لگا کہ اس کا مزاج درست کرنے کی ضرورت ہے۔

نہانے دھونے کے بعد اور گرم سوپ پینے کے بعد فواد خود کو کافی بہتر محسوس کر رہا تھا مگر اس کی بڑی بڑی آنکھوں میں جلتا ہوا غم پہلے روز کی طرح فروزاں تھا۔ یہ غم ان بھید بھری راتوں کا دیا ہوا تھا جو چالباز اندرانا نے اس پر اور اپنی بیٹی پر ٹھونسی تھیں۔ آج کی ملاقات میں اس حوالے سے کچھ اور باتیں بھی فواد سے معلوم ہوئیں۔ پرنس اور زرش جہاں کی ناخوشگوار ازدواجی زندگی کے بارے میں بات کرتے ہوئے فواد نے بتایا۔ ”کہا جاتا ہے کہ شادی سے پہلے پرنس کسی لڑکی سے بہت ٹوٹ کر محبت کرتا تھا مگر پرنس کی والدہ اس لڑکی کے لیے کسی طور رضامند نہیں تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس لڑکی کی شادی پرنس سے نہ ہو سکی۔ پرنس کی والدہ نے اس کے لیے زرش جہاں کو چنا، اور پرنس نے والدہ کی منشا کے سامنے سر جھکا دیا۔ لیکن پرنس کبھی بھی زرش کو وہ پیار نہ دے سکا جو ایک بیوی کا حق ہوتا ہے......“

”اس دوسری لڑکی کا کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کی شادی بھی کہیں اور ہو گئی۔ اپنے دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران میں وہ مر گئی تھی۔“ فواد نے بتایا۔

اس قسم کی کچھ بات میں اس سے پہلے ماہین سے بھی سن چکا تھا۔ اب اس کی تصدیق ہو رہی تھی۔ کڑیاں جیسے آپس میں مل رہی تھیں۔ پرنس اور زرش جہاں نے چھ سات برس تک بالکل غیر مطمئن ازدواجی زندگی گزاری۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب اندرانا کے انوکھے فیصلے کے نتیجے میں زرش

جہاں، فواد سے ملی اور اس کے ساتھ ''وقت'' بسر کیا تو اس کا نتیجہ کچھ اور نکل آیا۔ کم از کم فواد کی حد تک تو یہ ''نتیجہ'' بالکل واضح تھا۔ وہ حسین زرش کی ''قربت'' کا شکار ہو چکا تھا۔

☆☆☆

ساری رات بازو کے زخم میں درد رہا۔ یہ عجیب سا درد تھا۔ بازو سے لے کر چھاتی تک پھیل رہا تھا۔ مجھے لگا کہ اس کی وجہ بڑھی ہوئی سردی بھی ہے۔ ناشتے سے پہلے میں نے جیکٹ پہننے کے لیے ہینگر سے اتاری تو ایک کاغذ سائڈ پاکٹ سے نیچے گر گیا۔ میں نے یہ تہ کیا ہوا کاپی سائز کا کاغذ کھولا تو دنگ رہ گیا، یہ خون سے لکھی ہوئی ٹیڑھی میڑھی تحریر تھی۔ زبان اردو ہی تھی۔ یہ خط غنچہ کی طرف سے تھا۔ میں ٹپٹا کر رہ گیا۔ شکر کا مقام تھا کہ عمران کمرے میں موجود نہیں تھا ورنہ وہ ضرور کوئی لطیفہ گھڑ لیتا۔ خط ویسا ہی تھا جیسا کوئی نوعمر اور احمق لڑکی جوانی کے جوش میں لکھ سکتی ہے۔ لایعنی باتوں اور دو چار عشقیہ شعروں کے بعد اس نے تحریر فرمایا تھا...... ''آپ نے میری زندگی بچائی ہے۔ جو زندگی بچاتا ہے زندگی اسی کی ہوتی ہے۔ آپ میرے لیے کسی دیوتا سے کم نہیں ہیں۔ آپ کے چرنوں میں اپنی زندگی قربان کرنا میری سب سے بڑی آرزو ہے۔''

اسے اپنی اور میری عمر کا ذرہ بھر خیال نہیں تھا۔ میں نے دانت پیس کر خط آتشدان میں پھینک دیا۔ اسی دوران میں ہلکا سا شور سنائی دیا اور پھر باوردی ملازم نے آ کر اطلاع دی کہ پرنس مجھ سے ملنے تشریف لا رہے ہیں۔ میں انیکسی کی نشست گاہ میں آ گیا۔ پرنس تپاک سے ملا۔ ساتھ ڈاکٹر عظیم بھی تھا۔ دونوں نے میرا حال دریافت کیا۔ میں نے رات بھر رہنے والے درد کے بارے میں بتایا۔ ڈاکٹر عظیم نے میری بینڈیج کھولی اور بڑی احتیاط سے زخم کا معائنہ کرنے لگا۔ اس کے سنجیدہ چہرے پر تفکر کے تاثرات ابھرے۔ مجھے لگا کہ ڈاکٹر نے اشارے کنایے میں پرنس سے کچھ کہا بھی ہے۔

میں نے سوالیہ نظروں سے پرنس کی طرف دیکھا۔ وہ ایک گہری سانس لے کر ٹھہرے لہجے میں بولا۔ ''تابش صاحب! میں آپ کو اندھیرے میں نہیں رکھنا چاہتا۔ یہ آپ کی صحت اور سلامتی کا معاملہ ہے۔ آپ کا یہ زخم معمولی نہیں ہے۔''

میں نے ہونٹوں پر مسکراہٹ لا کر کہا۔ ''مجھے آپ کے رویے سے کچھ کچھ اندازہ ہو رہا تھا۔''

پرنس نے بات آگے بڑھائی۔ ''دراصل...... جس آلے سے آپ کو یہ زخم لگایا گیا اس کی دھار پر زہر تھا۔ ہم لوگ مقامی زبان میں اسے گورنی کا زہر کہتے ہیں، یہ شہد کی مکھی کے ڈنک سے تیار کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عظیم کو شروع میں ہی اندازہ ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ڈاکٹر نے زخم کو چھیلنے اور دھونے میں بہت زیادہ وقت لیا۔ اس سے زہر کی شدت تو کچھ کم ہو گئی مگر اثرات مکمل طور پر ختم نہیں ہوئے۔''

یہاں تک کہہ کر پرنس نے ڈاکٹر عظیم کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو کہ وہ بھی کچھ بولے۔ ڈاکٹر عظیم صاف لہجے میں بولا۔ ''تابش صاحب، اگر راستے کھلے ہوتے تو میں فوراً آپ کو اسکردو یا پھر ایبٹ آباد وغیرہ منتقل کرانے کی کوشش کرتا۔ لیکن فی الحال یہ ممکن نہیں۔ لہٰذا ہم سے یہیں جو کچھ بن پڑے گا ہم کریں گے۔ آپ کو بھی حوصلہ رکھنا ہو گا اور ہمت نہیں ہارنا ہو گی۔ مجھے امید ہے کہ ہم...... ''اوورکم'' کر لیں گے۔''

میں نے بازو کے زخم پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''یہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ زخم کچھ نیلا پڑتا جا رہا ہے۔ کیا یہ اثر باقی جسم پر بھی ہو گا؟''

ڈاکٹر اور پرنس نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا، پھر پرنس گویا ہوا۔ ''تابش صاحب، میں آپ کو ڈرانا نہیں چاہتا اور نہ ہی یہ چاہتا ہوں کہ آپ اندھیرے میں رہیں۔ دراصل یہ زہر کبھی کبھی جسم میں شدید قسم کا انفیکشن پیدا کر دیتا ہے۔ جسم سوج جاتا ہے اور بخار کے ساتھ خشک کھانسی بھی شدت پکڑ لیتی ہے۔ ہم اس بیماری کو گورنی کی نسبت سے گورنام کہتے ہیں۔ یہ تکلیف اکثر سانس کے ذریعے پھیلتی بھی ہے۔ لہٰذا مریض کو دوسروں سے ذرا الگ رکھا جاتا ہے۔ ساتویں، آٹھویں روز تکلیف کا زور ٹوٹ جاتا ہے اور ڈیڑھ دو ہفتے میں مریض ٹھیک ہو جاتا ہے۔'' آخری الفاظ کہتے کہتے پرنس کا لہجہ تسلی تشفی والا ہو گیا۔

ڈاکٹر عظیم نے کہا۔ ''سانس کے ذریعے اس بیماری کے پھیلنے کا چانس بہت زیادہ نہیں ہے لیکن مقامی لوگ اس ''پھیلاؤ'' پر بہت یقین رکھتے ہیں۔ بہر حال احتیاط ضروری ہے، میں ایک بار پھر کہوں گا کہ آپ کو ذرا حوصلے اور ہمت سے کام لینا ہو گا۔ آپ ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔''

پرنس کے رعب دار چہرے پر گہری سنجیدگی تھی۔ مجھے یوں لگا جیسے ان لمحوں میں اس کی نگاہ میں اسی عالم خان کی شبیہ گھوم رہی ہے جس نے مجھ پر حملہ کیا تھا اور اس خونی وار کے بعد ٹنگرے خاناں کی گود میں جا چھپا تھا۔ (ٹنگرے کا پورا نام ٹموک ٹنگرے خاناں تھا تاہم اسے صرف ٹنگرے یا ٹنگرے خاناں کہا جاتا تھا)

یہ سب کچھ یقیناً پریشان کن تھا اور اس لحاظ سے کچھ اور زیادہ بھی کہ مناسب طبی امداد نہیں مل سکتی تھی۔ میں نے اس بارے میں فی الحال عمران اور ماہین کو بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ ویسے بھی مجھے اپنی قوتِ برداشت پر اعتماد اور بھروسا تھا۔ میں نے جسمانی تکالیف کے حوالے سے ماضی میں بہت کچھ کامیابی سے سہا تھا۔ اس رات پھر درد کی شدت رہی تاہم سوجن اور بخار وغیرہ کے آثار نظر نہیں آئے۔ دل میں امید پیدا ہونے لگی کہ شاید بلا ٹل ہی جائے۔ ڈاکٹر عظیم نے باقاعدگی سے میری میڈیکیشن جاری رکھی ہوئی تھی۔

اگلے روز شام کو ماہین کی زبانی معلوم ہوا کہ پرنس، شازمینہ کو واپس خاقان ولا میں لانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ شازمینہ کی خوش اخلاق والدہ وردا خانم بھی ساتھ ہی آئی تھیں، تاہم والد نے فی الوقت اپنے عزیزوں کے ہاں ہی رہنے کو ترجیح دی تھی۔ ماہین کی زبانی یہ بھی پتا چلا کہ پرنس کے حکم پر غنچہ بھی خاقان ولا میں واپس آگئی ہے۔ اس کو واپس لانے کی وجہ یہ تھی کہ مجھ پر ہونے والے حملے کے بعد پرنس بخت اور خنگرے خاناں کے درمیان پھر شدید کشیدگی پیدا ہو گئی تھی۔ ایسے میں اس بات کا خدشہ ہو سکتا تھا کہ خنگرے خاناں پھر غنچہ پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرے۔

میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ ''ماہین! لیکن اب اس بستی میں فواد کی حفاظت کون کرے گا؟''

ماہین رازداری کے انداز میں بولی۔ ''انکل تابی! میں غنچہ سے مل چکی ہوں، اس کا کہنا ہے کہ اگر پرنس جی کا حکم نہ ہوتا تو وہ کبھی بھی نہ آتی۔ بہرحال اب وہ اپنی بہن ایمل کی مکمل ذمے داری لگا کر آئی ہے۔ فواد وہاں بالکل محفوظ رہے گا۔''

اسی دوران میں، میں نے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ شفق رنگ شام میں خاقان ولا کے درودیوار اجلے نظر آرہے تھے۔ زنان خانے کے سامنے سرسبز لان میں شازمینہ اپنی والدہ اور ولا کی دیگر خواتین کے ساتھ موجود تھی۔ ملازمائیں اور مشاطائیں وغیرہ شازمینہ کی یہاں دوبارہ آمد پر بہت خوش دکھائی دیتی تھیں اور اس کے اردگرد چہک رہی تھیں۔ وہ ایک گلابی اونی پہناوے میں تھی اور درمیانی شکل و صورت کے باوجود دلکش نظر آتی تھی۔ ماہین اسے دیکھ کر خوش ہوئی اور اس سے ملنے لان کی طرف چلی گئی۔

رات کو میرے زخمی بازو میں درد تو ہوتا رہا لیکن باقی خیریت ہی رہی۔ اگلے روز سہ پہر میں پرنس سے ملاقات ہوئی۔ میں نے اس سے نجی حالات کے بارے میں کچھ نہیں پوچھا تھا، نہ ہی اس نے کچھ بتایا تھا...... تاہم زرش جہاں کو طلاق کی خبر ایسی نہیں تھی جو چھپنے والی ہو۔ اس حوالے سے دبی دبی سرگوشیاں خاقان ولا میں ہو رہی تھیں۔ یقیناً سب حیران تھے کہ بچے والی غیر معمولی خوشی ملنے کے بعد ایک دم کیا ہوا کہ جوڑے میں علیحدگی ہو گئی اور ماں بیٹی کو خوار ہو کر ولا سے نکلنا پڑا۔

میرے بازو میں زخم لگے اب چار پانچ دن گزر چکے تھے۔ پرنس بخت کو جیسے امید سی پیدا ہونے لگی تھی کہ شاید مجھ میں وہ شدید علامات ظاہر نہ ہوں جو زخمی کو قریب المرگ کر دیتی ہیں۔ ڈاکٹر عظیم کے خیالات بھی کچھ ملتے جلتے ہی تھے۔ غنچہ مہمان خانے کے اردگرد ہی موجود رہتی تھی۔ شام کو گل دان میں تازہ پھول رکھنے کے لیے وہ میرے کمرے میں چلی آئی۔ بہت ہیجان خیز لباس میں تھی۔ موسم سرما کے چھوٹے چھوٹے نیلے پھول اس کے جوڑے میں بھی سجے ہوئے تھے۔ میرا خیال تھا کہ اپنے بے ہودہ ''خونی'' خط کی وجہ سے وہ مجھ سے نظریں نہیں ملائے گی مگر پتا نہیں کس ''بے جھجک مٹی'' کی بنی ہوئی تھی۔ بڑی فدویانہ نظروں سے میری طرف دیکھ کر اس نے لمبی سرد آہ بھری اور پھول گل دان میں لگاتے ہوئے اپنی سرخ چنری اس طرح سامنے سے سرکائی کہ سراپا دعوت نظر آنے لگی۔

''میں نے یہاں مہمان خانے میں ہی ڈیوٹی لگوائی ہے جی۔ کوئی بھی ''خدمت'' ہو مجھے آواز دیجیے گا۔'' اس کے لہجے میں جذبات کی تیز آنچ تھی۔

میں خاموش رہا۔ فواد کے بارے میں کچھ پوچھنے بتانے کا یہ موقع نہیں تھا۔

وہ آدھی رات بھی خیریت سے گزر گئی، مگر پھر وہ کچھ ہونا شروع ہو گیا جس کا خدشہ تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ ہاتھ پاؤں کی انگلیوں پر ورم آرہا ہے اور کچھ بخار بھی ہو گیا ہے۔ صبح سے پہلے ہی یہ علامات واضح ہو گئیں۔ دوپہر تک یہ حال تھا کہ پورا جسم جیسے انگاروں پر تھا۔ سوجن بڑھتی جا رہی تھی اور آنکھوں سے مسلسل تیزابی پانی بہہ رہا تھا۔

اس موقع پر میں نے اپنے ساتھیوں کو آگاہ کر دینا مناسب سمجھا۔ میں نے عمران اور ماہین کو بلا کر وہ سب کچھ بتا دیا جو ڈاکٹر اور پرنس بخت سے معلوم ہوا تھا۔ ماہین کا رنگ سفید پڑ گیا، عمران بھی شدید کرب میں نظر آنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''ابھی یہ علامات ظاہر ہوئی ہیں۔ یہ کافی آگے جائیں گی۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا یہی ہے کہ مجھے کچھ دن کے لیے بالکل علیحدہ رہنا پڑے گا۔''

ماہین نے ہاتھ بڑھا کر میرا ٹمپریچر دیکھنے کی کوشش کی۔ میں نے اسے منع کر دیا۔ اسی دوران میں ڈاکٹر عظیم اور پرنس تیز قدموں سے کمرے میں داخل ہوئے۔ آج ایک اور ڈاکٹر بھی ان کے ساتھ تھا۔ انہوں نے ماہین اور عمران کو باہر جانے کا کہا۔ میرے بازو کے زخم اور وائٹل سائنز کا معائنہ شروع ہو گیا۔

☆☆☆

اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں میری تکلیف بدترین صورت اختیار کر گئی۔ پورے جسم پر سوجن آگئی، خاص طور سے بالائی دھڑ پر۔ شدید بخار تھا اور سانس سینے میں آرے کی طرح چل رہی تھی۔ لیٹتے ہی شدید کھانسی شروع ہو جاتی تھی، لہٰذا مجھے تکیے کے سہارے نیم دراز ہونا پڑتا تھا۔ ڈاکٹر عظیم کے لیے بھی یہ ایک امتحان تھا، کیونکہ صرف وہی میری ٹریٹ منٹ کے لیے میرے کمرے میں آرہا تھا۔ وہ میرے پاس آتے ہوئے خاص قسم کا ایپرن پہنے ہوتا تھا۔ منہ پر سرجیکل ماسک اور ہاتھوں میں دستانے ہوتے تھے۔ ملازمہ کھانے والی ٹرالی تیار کر کے دروازے پر لے آتی تھی۔ اسے اندر لانے والا بھی ڈاکٹر عظیم ہی ہوتا تھا، کھانے کا تو بس تکلف ہی کیا جارہا تھا۔ میں دو چار لقمے ہی لیتا تھا، اس کے بعد معدہ وارننگ دینے لگتا تھا کہ مزید کچھ لو گے تو میں واپس کر دوں گا۔

گزرے ماہ و سال میں اذیت جھیلنا میرے لیے ایک مشغلے کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ سخت ترین مشقت اور تکلیف مجھے ذہنی اور جسمانی طور پر زیادہ متاثر نہیں کرتے تھے، پھر بھی اس "گورنام" نامی بلا نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ میں ہر پل انگاروں کے بستر پر ہوں۔

میری اس حالت کا میرے میزبانوں اور خاص طور سے پرنس کو بہت رنج تھا۔ مجھے یہ بھی پتا چلا تھا کہ پنچایت قسم کی جو میٹنگ ہوئی تھی اس میں بندوقیں نکلتے نکلتے رہ گئی تھیں۔ درحقیقت میری وجہ سے بالاٹ کے عالم خان نامی بدمعاش کی جو بے عزتی ہوئی تھی اُسے شنکرے خاناں نے اپنی بے عزتی سمجھا تھا۔ ویسے بھی مقامی رہن سہن میں یہ بات طے تھی کہ باہر سے آنے والے لوگوں کو ان بستیوں میں ایک آدھ دن سے زیادہ نہیں ٹھہرایا جائے گا۔ اس کے برعکس ہم کافی دنوں سے یہاں موجود تھے۔

تیسرے روز رات نو دس بجے کا وقت تھا۔ میں درد کی شدت سے سر پٹخ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ میں تکلیف برداشت نہیں کر پا رہا تو عام لوگ خاص طور سے عورتیں اور بچے وغیرہ اس موذی بیماری میں مبتلا ہو کر اسے کیسے جھیلتے ہوں گے۔ اچانک دروازہ کھلا اور عمران اندر آگیا۔ اس نے منہ پر سرجیکل ماسک چڑھا رکھا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں کھانے کی ٹرے تھی۔ اس نے ٹرے میرے سامنے میز پر رکھی۔ "کیسے ہیں آپ؟" وہ اطمینان سے بولا۔

"عمران! یہ کیا کر رہے ہو۔ تمہیں پتا نہیں ڈاکٹروں نے کیا کہا ہے۔ چلو باہر جاؤ، چلو نکلو۔"

"چلو نکلو، تو آپ نے میری چڑ ہی بنا لی ہے۔ چلو نکلو کمرے سے...... چلو نکلو لاہور سے...... چلو نکلو پاکستان سے۔"

"عمران! یہ مذاق کا وقت نہیں ہے۔" میں اتنی زور سے بولا کہ شدید کھانسی ہونے لگی۔ گلے میں پھندا سا لگ گیا اور میں کروٹ کے بل دہرا ہو گیا۔

وہ لپک کر آگے آیا۔ مجھے سیدھا کیا۔ مجھے پانی پلانے کی کوشش کی۔ میں نے ایک گھونٹ پانی پی کر اسے پھر پیچھے دھکیل دیا۔ "عمران! ایسا مت کرو۔ جاؤ یہاں سے۔ ڈاکٹر عظیم میری دیکھ بھال کر رہا ہے نا۔" میرا لہجہ ہانپتا ہوا تھا۔

"آپ کو دیکھنا ڈاکٹر عظیم کی ڈیوٹی ہے لیکن میرا یہ فرض ہے۔ میں آپ کو اس طرح تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔" وہ اٹل لہجے میں بولا۔

اس نے اپنی پتلون کی جیب سے سرجیکل دستانے نکال کر پہنے اور پھر اطمینان سے کرسی گھسیٹ کر میرے سامنے بیٹھ گیا۔

"نہیں عمران، میں تمہیں ایسا نہیں کرنے دوں گا۔" میں نے کراہتے ہوئے کہا۔

"نہیں چاچو، آپ واہموں کا شکار نہ ہوں۔ یہ تکلیف ضرور ہے لیکن ایسی بھی نہیں کہ اسے 'ہوا' بنا لیا جائے۔ میں نے دونوں ڈاکٹر صاحبان سے بات کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ احتیاطی تدابیر کے ساتھ مریض کی دیکھ بھال کی جاسکتی ہے۔"

"تو ہو رہی ہے نا دیکھ بھال۔ تم خود کو کیوں نشانہ بنانا چاہتے ہو؟" میرا لہجہ کربناک ہو گیا۔

"آپ مقامی لوگوں کی زبان بول رہے ہیں چاچو جان، جنہوں نے اسے موت کا دوسرا نام دے رکھا ہے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی "بہادر" ہوں گے جن کا بس چلے تو ایسے مریض کو زندہ دفن کر ڈالیں۔ یہ کم عقلی اور دقیانوسیت کی انتہا ہے۔"

"مگر عمران......"

"مگر کچھ نہیں چاچو جان! احتیاط ضروری ہے لیکن موت کے خوف کو سر پر سوار کرنے والا میں نہیں ہوں۔ آپ

بے فکر رہیں، مجھے کچھ نہیں ہوگا۔''
میرے اندر اتنی سکت نہیں تھی کہ عمران سے بحث کر سکوں۔ دو لفظ بول کر سانس پھول جاتی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر کے اپنا سر تکیے پر رکھ دیا۔
وہ ارادے کا اٹل تھا، اور وہ میرے پاس اس کمرے میں رہنے کا ارادہ کر چکا تھا۔ میرے مسلسل انکار کے باوجود وہ میرا سر دبانے کے لیے میرے سرہانے بیٹھ گیا۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ درد میں کچھ کمی واقع ہوئی تو اس نے بے حد اصرار کے ساتھ مجھے چند لقمے کھلائے اور میڈیسن دی۔ اس کے خوب صورت چہرے پر کسی خوف یا اندیشے کا شائبہ تک نہیں تھا۔
''کس مٹی کے بنے ہوئے ہو تم؟'' میں نے کراہتے ہوئے کہا۔
''کہا تو ہے، اسی پاکستانی مٹی کا، جس سے آپ بنے ہیں اور آپ کا ''پیارا دوست'' بنا تھا۔ آپ بھولے تو نہیں ہوں گے اسے۔''
میری آنکھوں میں نمی آ گئی۔
میں نے ماہین کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا۔ ''وہ بھی آنا چاہ رہی تھی جی، لیکن میں نے منع کر دیا۔ کچھ بھی ہے عورت ذات ہے۔ آپ کو پتا ہی ہے ہمارے ہاں کی عورتیں اچھے بھلے مریض کی عیادت کر کے اس کی حالت نازک کر دیتی ہیں۔ اسے یہ باور کرا دیتی ہیں کہ وہ قریباً قریباً فوت ہو چکا ہے۔''
اسی دوران میں ڈاکٹر عظیم بھی آ گیا۔ وہ میرے پاس عمران کو دیکھ کر کچھ الجھن میں نظر آیا۔ بہرحال عمران نے تھوڑی سی کھسر پھسر کر کے اسے مطمئن کر دیا۔ غالباً یہی بتایا کہ وہ پوری احتیاط کر رہا ہے۔
رات کوئی گیارہ بجے کا عمل ہوگا، ڈاکٹر عظیم نے ڈرپ میں دو تین انجکشن لگائے تھے، تکلیف میں انیس بیس کی کمی واقع ہوئی تھی مگر سانس اب بھی سینے میں کند آرے کی طرح چل رہی تھی۔ کمرے کے کھڑکیاں دروازے بند رکھے گئے تھے۔ عمران مجھ سے چار پانچ فٹ کے فاصلے پر کرسی ڈالے بیٹھا تھا اور ہر پل مجھ پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔ میری نگاہ ایک کھڑکی کی طرف اٹھی تو وہاں غنچہ کا چہرہ نظر آیا۔ وہ ڈری ہوئی سی نظروں سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔
عمران بولا۔ ''لیں جی، آپ پر جان نچھاور کرنے والے بھی آ گئے۔''
پھر اس کے دل میں نجانے کیا آئی اس نے اٹھ کر کھڑکی کا پٹ تھوڑا سا کھولا اور غنچہ کو اندر آنے کا کہا۔
''جی..... کیا؟'' وہ حیرت زدہ نظر آئی۔
''تھوڑی سی مدد کرو میری، یہ کھانے کی خالی ٹرے اور برتن لے جاؤ کمرے سے۔'' وہ کھڑکی کے سامنے سے اوجھل ہو گئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ گھوم کر دروازے کی طرف آئے گی مگر وہ نہیں آئی۔
عمران مسکرایا اور دوبارہ کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''لو جی...... لگتا ہے کہ وہ تو سونے چلی گئی۔''
رات جیسے تیسے کٹ گئی۔ تکلیف تو کم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ تاہم عمران کی مسلسل موجودگی سے کئی آسانیاں پیدا ہو گئی تھیں۔ میرے بار بار منع کرنے کے باوجود وہ کمرے سے جانے کو تیار نہیں تھا۔ اگلے روز دوپہر تک بالائی دھڑ کی سوجن اور بخار کی شدت بہت بڑھ گئی۔ ڈاکٹر کی ہدایت پر عمران میرے سر پر مسلسل ٹھنڈی پٹیاں رکھنے لگا۔ اب قے آنا بھی شروع ہو گئی تھی۔ معدہ تقریباً خالی تھا، پانی ہی نکل رہا تھا۔ ہر بار جب قے آتی، عمران بڑے اطمینان سے ڈسٹ بن میرے منہ کے سامنے کرتا، یا پھر ایک کپڑے میں قے کو سمیٹتا اور دوسرے کپڑے سے میری گردن وغیرہ صاف کرتا۔ تب پھر میرے قریب بیٹھ کر برف کی پٹیاں رکھنے لگتا۔ گاہے بگاہے وہ انٹرکام پر ڈاکٹر عظیم سے رابطہ بھی رکھے ہوئے تھا۔
''عمران! پلیز جاؤ۔'' میں نے نیم غشی کی سی حالت میں کہا۔
''چلا جاؤں گا تو بہت یاد کرو گے۔ اب تھوڑا وقت اپنے ساتھ گزار لینے دیں۔ چھوٹی موٹی خدمت کر لینے دیں۔'' وہ اپنے مخصوص انداز میں بولا۔
''تم کیا چیز ہو عمران؟''
''اور آپ کیا چیز ہو چاچو، میں دیکھ رہا ہوں جتنی تکلیف اس وقت آپ کو ہے، کوئی لوہے پتھر کا بندہ بھی ہوتا تو رونے چلانے لگتا۔ آپ نے ایک بار ہائے بھی نہیں کیا۔''
''بس دعا کرو، یہ بھرم قائم رہے۔'' میں نے آنکھیں بند کیے کیے کہا۔ ان لمحوں میں ہڈیوں کا ڈھانچا بارونداجیکی جیسے میرے سامنے آن کھڑا ہوا۔ اس کے لہجے میں وہی برسوں پرانی حمکنت اور تلوار جیسی کاٹ تھی۔ وہ کہہ رہا تھا..... تکلیف کی شدت وہ نہیں ہوتی جو ہمارے دل و دماغ محسوس کرتے ہیں۔ تکلیف کی اصل شدت بہت کم ہوتی ہے۔ اس کی اصل شدت پر دھیان دو تو اس میں کمی محسوس کرو گے۔

وہ قیامت کے تین روز تھے۔ کسی وقت غشی سی طاری ہو جاتی تھی۔ اس غشی میں مجھے محسوس ہوتا تھا کہ شاید یہیں اس برف زار میں مجھے دفنا دیا جائے گا۔ عمران اور ماہین آنکھوں میں آنسو لیے یہاں سے واپس چلے جائیں گے۔ پھر کسی اور موسم میں وہ لوگ یہاں آئیں گے۔ گزری باتیں یاد کریں گے۔ سوچیں گے کہ یہاں مجھ پر وہ غصیلا عالم خان حملہ آور ہوا تھا۔ یہاں اس درخت کے پاس اس نے مجھ پر وار کیا تھا پھر وہ اس طرف کو بھاگا تھا...... اور یہاں اس خاقان ولا کے اس کمرے میں، میں نے تڑپ، تڑپ کر جان دی تھی۔

غشی کے ان مایوس کن دوروں کا اختتام عموماً عمران کے محبت بھرے لمس سے ہوتا تھا۔ وہ کبھی میرا ماتھا سہلا رہا ہوتا، کبھی سینے پر مالش کر رہا ہوتا اور کبھی شاید میرا سر چوم رہا ہوتا تھا۔ بیماری کے ساتویں، آٹھویں روز مجھے محسوس ہوا کہ تکلیف میں چڑھاؤ نہیں رہا۔ وہ ایک جگہ ٹھہر گئی ہے یا شاید تھوڑی بہت کم ہوگئی ہے۔ اگلے دس بارہ گھنٹوں میں یہ خیال تقویت پکڑ گیا۔ بخار کنٹرول میں تھا اور سانس کے ساتھ جو کند چھری سی سینے میں چلتی تھی کچھ دھیمی پڑ گئی تھی۔

اس رات جب عمران میری پشت کو اپنے کندھے کی ٹیک فراہم کر کے مجھے چند نوالے کھلا چکا تھا اور دوبارہ لٹا رہا تھا کھڑکیوں کے سامنے سے غنچہ گزری۔ عمران کو نہ جانے کیا سوجھی مجھے لٹا کر جلدی سے کھڑکی پر پہنچا اور اسے کھول کر پکارا۔ ”غنچہ کہاں جا رہی ہو؟“

اس نے مری مری آواز میں کچھ کہا۔ عمران تحکم سے بولا۔ ”ٹھہرو، تم سے کام ہے۔“

وہ رک گئی۔ عمران دروازہ کھول کر باہر نکلا۔ میں اسے روکتا ہی رہ گیا۔ ایک منٹ بعد وہ اس طرح دروازے پر نمودار ہوا کہ اس نے غنچہ کو کلائی سے پکڑ رکھا تھا اور وہ کسی اڑیل بکری کی طرح خود کو پیچھے کی طرف سرکا رہی تھی۔ اسے اندر لا کر عمران نے دروازہ بند کیا اور ذرا رعب سے بولا۔ ”کوئی آدم خور بلا نہیں ہے یہاں، جو تمہیں نگل جائے گی۔ دیکھو میں بھی تو پانچ چھ دن سے یہیں پڑا ہوں۔ ڈاکٹر بھی آتے جاتے ہیں۔ ملازم نوروز خان بھی صفائی کے لیے آتا ہے۔ ہم سب زندہ ہیں۔ تمہیں بھی کچھ نہیں ہوگا۔“

”لل...... لیکن میرے پیٹ میں درد......“

”تمہارے پیٹ میں صرف خوف کا درد ہے اور کچھ نہیں ہے۔ صرف تین چار گھنٹوں کی بات ہے۔ میں ذرا نیند پوری کرلوں۔ فریش ہو کر صبح پانچ بجے سے پہلے پھر یہاں

ہوں گا۔ تم نے کرنا کیا ہے؟ بس یہاں دروازے کے پاس چیئر پر بیٹھی رہو۔ اول تو یہ سوتے رہیں گے۔ اگر پانی وغیرہ مانگیں تو دے دینا۔"
میں نے دیکھا غنچہ کا چہرہ برف کی طرح سفید پڑ گیا تھا۔
"مم...... میں...... وہ...... اگر...... لیکن......" وہ شکستہ اردو میں ہکلا کر رہ گئی۔
عمران طنزیہ انداز میں مسکرایا۔ "دیکھو، خدا کا خوف کرو۔ یہ کوئی اور نہیں تابش صاحب ہیں۔ جن پر تم جان نچھاور کرتی ہو۔ اپنے خون سے ان کو خط لکھتی ہو۔ تم نے ہی کہا تھا نا کہ آپ میرے لیے کسی دیوتا سے کم نہیں۔ آپ کے چرنوں میں زندگی قربان کرنا چاہتی ہوں۔ یہاں زندگی کی قربانی کون مانگ رہا ہے۔ تین چار گھنٹے ہی مانگ رہا ہوں۔ زیادہ ڈر ہے تو یہ ماسک وغیرہ لگا کر کمرے کے اس آخری کونے میں بیٹھ جاؤ۔"
وہ جان چھڑانا چاہ رہی تھی مگر عمران نہیں چھوڑ رہا تھا۔ اس نے اسے ماسک اور دستانے وغیرہ پہنائے اور دروازے کے بالکل پاس کرسی پر بٹھا کر دروازہ باہر سے لاک کر دیا۔ میں ایک بار پھر اسے منع کرتا ہی رہ گیا۔
میں سمجھ گیا تھا کہ وہ غنچہ کو اس کے ناپختہ اور ہیجانی جذبات کی سزا دینا چاہتا ہے اور یہ واقعی اس کے لیے سزا ہی تھی۔ وہ کرسی پر یوں سمٹی سمٹائی بیٹھی تھی جیسے اس پر چاروں طرف سے قاتل جرثومے یلغار کر رہے ہوں اور وہ کسی بھی وقت پھڑک کر اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دے گی۔ اس کا جسم جو اپنے اندر کمال کا تناسب اور دلکشی رکھتا تھا کسی مرجھائے ہوئے پتے کی طرح کرسی پر سمٹا ہوا تھا۔ مجھے لگا کہ اگر خدانخواستہ رات کو کسی وقت مجھے متلی ہوئی تو وہ خود بھی اپنا معدہ خالی کرنا شروع کر دے گی۔
رات کسی پہر میری آنکھ کھلی تو وہ کرسی پر نظر نہیں آئی۔ دروازہ باہر سے لاک تھا۔ کھڑکیوں پر آہنی گرل تھی۔ وہ کہاں گئی تھی؟ دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے باتھ روم میں گھس کر دروازہ بند کر رکھا ہے۔ اس کے کچے ذہن میں جان بچانے کا بس یہی طریقہ سمجھ میں آیا ہوگا۔ دوا کا اثر تھا، تکلیف کے باوجود میں پھر سو گیا۔
کچھ دیر بعد دوبارہ آنکھ کھلی تو سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ دونوں بازوؤں میں بھی جان لیوا اینٹھن تھی۔ عمران نے پین کلر دوا اور پانی کا گلاس میرے بالکل پاس ہی رکھا ہوا تھا مگر جب میں نے دوا نکالنے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو شیشے کی بوتل سائیڈ ٹیبل سے قالین پر گری اور پھر لڑھک کر بیڈ کے نیچے چلی گئی۔ میں سٹپٹا کر رہ گیا۔ غنچہ ابھی تک باتھ روم میں ہی بند تھی۔ میں نے اسے آوازیں دیں لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ تھا کر میں نے اپنی جسمانی توانائی کو سمیٹا اور ایک ہاتھ سے زخمی بازو کو سہارا دیتا ہوا بستر سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بخار کے سبب چکر سا آ گیا۔ خود کو سنبھال کر میں گھٹنوں کے بل جھکا اور بیڈ کے نیچے جھانکا۔ میڈیسن والی بوتل "رول" کر کے کافی آگے چلی گئی تھی۔ نیچے خلا مختصر تھا، میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ ہاتھ لمبا کر کے بوتل نکال سکوں۔ میں نے ایک بار پھر غنچہ کو پکارا۔ باتھ روم کا دروازہ بھی کھٹکھٹایا۔ اچانک مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اندر موجود ہی نہیں ہے پھر دروازہ اندر سے بند کیوں تھا؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ درد کی شدت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔
اسی دوران میں عمران فرشتۂ رحمت کی طرح وہاں پہنچ گیا۔ دروازہ ان لاک کر کے وہ کمرے میں چلا آیا۔
"غنچہ کہاں ہے؟" وہ چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولا۔
میں کراہ کر کرسی پر بیٹھ گیا اور باتھ روم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "وہ ڈر کر اندر گھس گئی ہے۔"
عمران نے بھی دو تین بار زور سے دروازہ کھٹکھٹایا پھر متبادل چابی سے باتھ روم کا دروازہ کھولا، باتھ روم خالی تھا۔ باتھ روم کی مستطیل کھڑکی کی جالی ادھڑی ہوئی تھی۔ یقیناً دہشت زدہ غنچہ وہاں سے نکل کر جا چکی تھی۔ یہ اسی خوف کی کارستانی تھی جو اکثر مقامی لوگوں میں کورنا بیماری کے حوالے سے پایا جاتا تھا۔
عمران نے مجھے دوا کھلائی، بستر پر لٹایا۔ اور مجھے کمبل اوڑھا کر میرے پاس بیٹھ گیا بولا۔ "دیکھ لیا جی، یہ کچے پکے ذہنوں کا طوفانی عشق کس طرح کا ہوتا ہے۔"
"تم بڑے چالباز ہو۔" میں نے کراہتے ہوئے کہا۔ "لیکن چلو، جو بھی ہوا اچھا ہوا، اسے جلدی سمجھ آ گئی۔"
"ویسے اتنا بے خبر نہیں ہوں میں۔ پچھلے دو ڈھائی گھنٹوں میں آپ کے اردگرد ہی موجود رہا ہوں۔" وہ ہولے سے مسکرایا۔ "مجھے پتا تھا وہ گدھی آپ کے قریب نہیں پھٹکے گی۔"
دوا کھانے سے طبیعت سنبھل گئی تھی۔ کچھ دیر بعد عمران باہر گیا اور آ کر اس نے مجھے بتایا۔ "غنچہ ولا کے اندر ہی ہے۔ اتنی شرمندہ ہے کہ میرے سامنے ہی نہیں آ رہی تھی۔"

میں نے کہا۔ ''اب اسے مزید شرمندگی سے بچانا۔ اس کے بھاگنے کا کسی کو نہ بتانا۔''

''اور وہ جو کھڑکی کی جالی ادھیڑ گئی ہے؟''

''اس کے لیے کوئی بہانہ بنا دینا۔'' میں نے کہا۔

''تمہارے پاس بہانوں کی کون سی کمی ہوتی ہے...... لیکن اب ایک بات ہمیں اور بھی سوچنا پڑے گی۔ فواد وہاں غنچہ کی بہن کی پناہ میں ہے۔''

''یعنی آپ کا مطلب ہے کہ غنچہ کے عشق والا بخار اتر گیا ہے اور اب وہ اور اس کی بہن، فواد کو پناہ دینے سے ہاتھ کھینچ سکتی ہیں۔''

''یہ ہو بھی تو سکتا ہے۔''

''نہیں ہوگا جناب۔'' وہ یقین سے بولا۔ ''میں اس حوالے سے غنچہ کے کان بڑی اچھی طرح کھول آیا ہوں۔ دونوں بہنیں ایسا رسک لینے کا سوچ بھی نہیں سکتیں۔''

اب صبح ہو چکی تھی۔ کمرے کی کھڑکیوں میں روشنی نظر آنے لگی تھی۔ اچانک لان کی طرف سے بلند آوازیں آئیں۔ یوں لگا کہ پرنس بخت آور کسی کو بُری طرح ڈانٹ ڈپٹ رہا ہے۔

عمران دیکھنے کے لیے انیکسی سے باہر چلا گیا۔ کچھ دیر بعد آ کر اس نے بتایا۔ ''پرنس لان میں اوپن ایئر بریک فاسٹ کر رہے تھے۔ شازمینہ اور والدہ وردا خانم بھی ساتھ تھیں۔ ایک ملازمہ نے سروس کرتے ہوئے گرم گرم کافی شازمینہ کے پاؤں پر گرادی۔ پرنس نے اسے غصے میں تھپڑ دے مارا۔''

''بچت ہوگئی شازمینہ کی؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں، لیکن پاؤں پر آبلے پڑ گئے ہیں۔ ڈاکٹر عظیم مرہم پٹی کر رہا ہے۔'' عمران جس ملازمہ کا ذکر کر رہا تھا۔ وہ خاقان ولا میں ہیڈ ملازمہ کے بعد سب سے اہم ملازمہ تھی۔ اسے حاجن رانی کہا جاتا تھا۔ نام سے لگتا ہے کہ وہ بڑی عمر کی ہوگی مگر وہ بڑی عمر کی نہیں تھی اور حاجن بھی نہیں تھی۔ کوئی عمرہ وغیرہ شاید اس نے کر رکھا تھا، اور وہ بھی یوں کہ وہ اپنے کارپینٹر شوہر کے ساتھ پانچ چھ ماہ سعودی عرب میں رہی تھی، پھر انہیں وہاں سے واپس آنا پڑا تھا، وہ بمشکل پچیس چھبیس سال کی چھریرے جسم والی لڑکی تھی لیکن کئی بڑی عمر کی ملازماؤں پر بھی حکم چلاتی نظر آتی تھی۔

بظاہر یہ ایک عام سا واقعہ تھا لیکن ہمیں معلوم نہیں تھا کہ چند ہی دن بعد یہ ایک بڑے واقعے کا پیش خیمہ بننے والا ہے۔

☆☆☆

مجھے افاقہ تو تھا لیکن طبیعت پوری طرح سنبھل نہیں رہی تھی۔ ڈاکٹر عظیم کا کہنا تھا کہ میرا زخم مندمل ہو رہا ہے اور میں خطرناک دورانیے سے گزر چکا ہوں۔ پھر بھی ڈاکٹر عظیم اور ڈاکٹر شاہد پوری طرح مطمئن نہیں تھے۔ ایک روز ڈاکٹر عظیم آیا تو اس نے انڈرویئر کے علاوہ میرے سارے کپڑے اتروا دیے اور جسم کا بغور معائنہ کیا۔

کہنے لگا۔ ''لگتا ہے کہ کوئی بڑی شدت سے آپ کے لیے دعائیں کرتا ہے۔ آپ خطرات سے نکل رہے ہیں لیکن ایک بات ذہن میں رکھیے، آپ خود بھی اپنے ہاتھ پاؤں اور جسم کا معائنہ کرتے رہیں۔ اگر کسی بھی حصے پر سرخ دھبے نظر آئیں یا وہاں پر اسکن کی رنگت نمایاں طور پر بدلی ہوئی ہو تو فوراً بتائیں۔''

''اس کا کیا مطلب ہے عظیم؟''

وہ ذرا توقف کر کے بولا۔ ''سمجھیں کہ یہ اس بیماری کا دوسرا ''فیز'' ہوتا ہے مگر یہ بہت کم ہی ظاہر ہوتا ہے۔ انشاء اللہ آپ اس سے محفوظ ہی رہیں گے۔ میں نے دیکھا ہے آپ کے اندر تکالیف کے لیے غیر معمولی مزاحمت موجود ہے۔''

''سرخ دھبوں سے مطلب کیا ہوتا ہے؟''

اس نے ایک دو میڈیکل اصطلاحات استعمال کرنے کے بعد کہا۔ ''یوں سمجھ لیں کہ جسم کی کچھ باریک نسوں میں اضافی خون جما ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ ایسی صورت میں مریض کو مکمل بیڈ ریسٹ اور خاص میڈیسنز کی ضرورت ہوتی ہے ورنہ معاملہ خراب ہو سکتا ہے لیکن ڈرنے کی بات نہیں۔ اگر فوری طور پر ابتدائی مرحلے میں ٹریٹ منٹ شروع کر دی جائے تو صحت یابی کے چانسز بڑھ جاتے ہیں۔''

سیانے ٹھیک ہی کہتے ہیں کہ تکلیف اور پریشانی آتو ایک دم جاتی ہے لیکن جاتے جاتے کافی وقت لیتی ہے۔ اب ڈاکٹر نے اس دوسری پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ بہرحال میں نے عمران اور ماہین کو اس بارے میں کچھ نہیں بتایا اور ڈاکٹر کو بھی منع کر دیا۔

اب احتیاطی تدابیر اختیار کر کے ماہین بھی میرے کمرے میں آجاتی تھی۔ وہ میری بہتر ہوتی صحت سے خوش تھی۔ آج کل وہ اپنا زیادہ وقت وڈیوز وغیرہ بنانے میں صرف کر رہی تھی۔ خاقان ولا اور اردگرد کے برف پوش مناظر اس کے یوٹیوب چینل کے لیے ایک بالکل نئی چیز ثابت ہو سکتے تھے۔ اس نے اپنے موبائل کیمرے پر مجھے

چند کلپس بھی دکھائے۔ یہ ان پرندوں کے تھے جو اس سخت ترین سردی میں بھی ہجرت کر کے یہاں سے نہیں گئے تھے۔ ان میں اُلّو، ووڈ پیکر اور رابن چڑیاں وغیرہ شامل تھیں۔ ایک وڈیو میں برفانی لومڑی بھی ایک ڈھلوان پر جھلک دکھاتی نظر آتی تھی۔

میں نے ماہین سے اندرانا بیگم اور اس کی بیٹی زرش کے بارے میں پوچھا۔

ماہین بولی۔ ''اس سلسلے میں مکمل خاموشی ہے انکل، کسی کو کچھ پتا نہیں کہ اس شام کیا ہوا اور کیسے ہوا۔ یہ بھی پتا نہیں کہ اندرانا بیگم اسی علاقے میں ہے یا بیٹی کے ساتھ کہیں اور نکل گئی ہے۔ لگتا ہے کہ خاقان ولا میں اس بارے میں بات کرنے پر بھی پابندی ہے۔''

میں نے کہا۔ ''شازمینہ تو تمہاری فرینڈ کی طرح ہے۔ اس نے بھی کوئی اشارہ نہیں دیا۔''

''نہیں انکل تابش، شازمینہ بڑی سادہ دل ہے۔ کسی کے بُرے میں نہیں ہے۔ بس اپنے کام سے کام رکھنے والی، بلکہ وہ تو شاید اس بات پر افسردہ بھی ہو کہ پرنس اور زرش میں آناً فاناً طلاق کیوں ہوگئی۔''

یہ دوسرے، تیسرے روز کی بات ہے۔ رات نو بجے کا وقت تھا۔ موسم پھر برف باری والا ہو رہا تھا۔ میرے کمرے میں آتش دان دہک رہا تھا۔ میں نے قمیص اتار رکھی تھی۔ ڈاکٹر عظیم میری جلد کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور قمیص وغیرہ پہننے میں میری مدد کی۔ وہ عمران سے بہت متاثر نظر آتا تھا...... کہنے لگا۔ ''تابش صاحب! بیماری کے دوران میں جس طرح عمران نے آپ کی تیمارداری کی ہے، یہ بہت متاثر کن ہے۔ بہت قریبی لوگ ہی اس طرح کے رسک لیتے ہیں۔ میں دیکھتا رہا ہوں۔ جب بیماری کا زور تھا اور آپ نیم غشی کی حالت میں ہوتے تھے یہ آپ کا سر اپنی گود میں لیے بیٹھا رہتا تھا۔ بہت دلیری کی بات ہے۔'' پھر ڈاکٹر عظیم نے تھوڑا سا توقف کیا اور بولا۔ ''ویسے یہ آپ کا لگتا کیا ہے؟''

''میں نے بتایا تھا نا بھتیجا ہے۔''

''لیکن آپ نے یہ بھی بتایا تھا کہ سگا بھتیجا نہیں ہے۔''

''وہ عظیم! کچھ لوگ سگوں سے بھی زیادہ سگے ہوتے ہیں۔ ان سے ہمارا کوئی خونی رشتہ نہیں ہوتا لیکن وہ مشکلات کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں روشنی کی کرن بن کر نمودار ہوتے ہیں اور ہمیں اپنے محفوظ حصار میں لے لیتے ہیں۔ ہماری طرف آنے والے آلام کو اپنے سینے پر جھیلتے ہیں اور ہمیں اپنی محبت کا قیدی بنا لیتے ہیں......'' میں جب یہ الفاظ کہہ رہا تھا میری نگاہوں میں عمران (عمران دانش) کا وجود دمکنے لگا تھا۔ وہی عمران جس نے برسوں پہلے مجھے خودکشی کے جبڑوں سے نکال کر زندگی کے راستوں پر چلایا تھا۔ آج شاید وہی عمران ایک بار پھر اپنے بیٹے کے روپ میں میرے پاس آ گیا تھا۔ وہ ایک بار پھر میری ڈھارس بننا چاہتا تھا۔ میرے کندھے سے کندھا ملانا چاہتا تھا...... لیکن مجھے کچھ عجیب واہموں نے گھیر رکھا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ زیادہ عرصہ میرے ساتھ رہے۔

ڈاکٹر عظیم چاہتا تھا کہ اب میں کسی وقت کمرے سے باہر تھوڑی سی چہل قدمی بھی کیا کروں۔ اس نے ملازم نوروز خان کو آواز دی لیکن نوروز سے پہلے ہی عمران لپکا ہوا کمرے میں آ گیا۔ اس نے سہارا دے کر مجھے بٹھایا۔ اپنے ہاتھوں سے مجھے چپل پہنائی اور پھر ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق مجھے آہستہ آہستہ چلاتا ہوا برآمدے میں لے آیا۔

''فواد کے بارے میں کیا اطلاع ہے؟'' میں نے سرگوشی میں اس سے پوچھا۔

''میں رات کو اس سے مل کر آیا ہوں۔ ایمل اچھی طرح اس کی دیکھ بھال کر رہی ہے۔ اس کی پنڈلی کی چوٹ بھی بہتر ہے لیکن وہ جو روگ اسے چمٹا ہوا ہے چین نہیں لینے دے رہا۔ زرش جہاں کے ساتھ جو راتیں اس نے گزاری ہیں وہ اس کے اندر گہرائی تک اُتر چکی ہیں...... وہ اس سے ملنا چاہتا ہے پھر سے اسے دیکھنا چاہتا ہے۔''

''زرش کو طلاق ہونے والی خبر کا پتا اسے چلا ہے یا نہیں؟''

''چل گیا ہے اور اس کی وجہ سے وہ اور بھی بے چین ہے۔ اسے لگتا ہے کہ اس طلاق کی وجہ بھی زرش کے ساتھ اس کا ناجائز تعلق ہی ہے۔ وہ اندرانا کو صلواتیں سناتا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف اس کی بیٹی کی زندگی خراب ہوئی بلکہ خود وہ بھی ایک نہ ختم ہونے والی اذیت میں جکڑا گیا۔''

چند لمحے توقف کر کے عمران نے مجھ سے پوچھا۔ ''آپ کا کیا خیال ہے چاچو، جو کچھ یہ فواد محسوس کر رہا ہے...... یہ یک طرفہ ہے یا پھر زرش کی طرف بھی اس کا تھوڑا بہت اثر موجود ہے۔''

''اس کے بارے میں یقین سے تو کچھ نہیں کہا جا سکتا لیکن زرش کی ازدواجی زندگی کبھی بھی خوشگوار نہیں رہی۔ یقینی بات ہے کہ اس کے اندر ایک خلا موجود تھا۔ فواد نے اس خلا

کو پُر کیا..... مگر پھر مقررہ وقت پر وہ اپنی ماں کی ہدایت کے مطابق اس سے علیحدہ ہوگئی۔ اب وہ اس علیحدگی اور دوری کو کہاں تک محسوس کرتی تھی یہ تو وہی بتا سکتی ہے۔''

عمران نے کہا۔ ''گود بھرائی کی رسم میں ماہین نے جو پکلس ہمیں دکھائے تھے ان میں وہ بڑی شان سے پرنس کے پہلو میں بیٹھی نظر آتی ہے لیکن غور سے دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس کی خوشی اور شادمانی کے اندر جو کھوٹ سا ہے وہ اُسے خود بھی محسوس کرتی ہے۔''

''میرا خیال بھی تم سے ملتا جلتا ہے۔''

تھوڑی سی چہل قدمی کے بعد میں ہانپ سا گیا اور برآمدے میں رکھی ہوئی ایک ایزی چیئر پر بیٹھ گیا۔ اچانک ولا کے رہائشی حصے کی طرف سے چلانے کی آواز آئی۔ پرنس بخت کا ایک جواں سال کزن عمر دراز بھاگتا ہوا اندرونی حصے سے برآمد ہوا۔ اس کے پیچھے فربہ اندام ہیڈ ملازمہ بھی دوڑی چلی آرہی تھی۔ عمر دراز، عمران کو دیکھ کر پکارا۔ ''ڈاکٹر عظیم کہاں ہیں؟''

''ابھی یہیں تھے، میرا خیال ہے ڈیوڑھی کی طرف گئے ہیں۔''

عمر دراز ڈیوڑھی کی طرف بھاگا۔ فربہ اندام ملازمہ سرتاپا لرزتی ہوئی ہمارے پاس پہنچی۔ وہ رو رہی تھی۔ ''کیا ہوا؟'' میں نے بلتی زبان میں اس سے پوچھا۔

وہ فریاد کناں انداز میں پکاری۔ ''کچھ پتا نہیں، شازمینہ بی بی اور وردا بیگم کی حالت خراب ہوگئی ہے۔ ان کے کھانے میں کسی نے زہر ملا دیا ہے۔ ہائے میرے اللہ، یہ کیا ہوگیا؟ کس نے توڑی ہے یہ قیامت؟'' وہ واویلا کرنے لگی۔

اسی دوران میں خود پرنس بخت بھی زنان خانے کے دروازے پر نظر آیا۔ آثار سے لگتا تھا کہ وہ بھی سخت شاک کی حالت میں ہے۔ ہم نے دور ڈیوڑھی کی طرف ڈاکٹر عظیم اور عمر دراز کو دیکھا۔ وہ بھاگتے ہوئے زنان خانے کی طرف آرہے تھے۔

''جلدی کرو۔'' پرنس دہاڑا۔

چند ہی سیکنڈ بعد وہ سب زنان خانے میں اوجھل ہو گئے۔ شور سن کر ماہین بھی اپنے کمرے سے نکل آئی تھی۔ جب ہم نے اسے بتایا کہ شازمینہ کے ساتھ کوئی سنگین معاملہ ہوگیا ہے تو وہ جیسے تڑپ گئی اور تیزی سے زنان خانے کی طرف چلی گئی۔ پورے ولا میں ایک دم ہی سنسنی اور تناؤ کی فضا پیدا ہوگئی تھی۔ ہم نے دیکھا لوگ تیزی سے زنان خانے میں آ اور جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ہم نے دوسرے سینئر ڈاکٹر شاہد کو دیکھا وہ بھی بھاگا ہوا زنان خانے کی طرف آرہا تھا۔ اس کے ساتھ ایک چترالی ملازم تھا جس نے ''نیبولائزر'' ٹائپ کی کوئی مشین اٹھا رکھی تھی۔

ہلکی برف باری شروع ہوگئی تھی۔ میں اور عمران کمرے میں آگئے۔ اسی اثنا میں ماہین بھی ہانپتی کانپتی پہنچ گئی۔ اس کی آنکھیں رونے سے سرخ ہو رہی تھیں۔ ''یہ زہر خورانی کا کیس ہے انکل۔ شازمینہ، اس کی والدہ اور پرنس بخت آج کل رات کا کھانا اکٹھے ہی کھاتے ہیں۔ ان کے کھانے میں کچھ ملایا گیا ہے۔ کوئی تیز قسم کا زہر ہے......'' ماہین کی آواز آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''لیکن ماہین، پرنس تو ٹھیک ہے؟''

''اسے پرنس کی خوش قسمتی کہہ لیں۔ انہوں نے ابھی ایک دو نوالے ہی لیے تھے کہ ان کے بیمار والد ان کو آوازیں دینے لگے۔ وہ کھانا چھوڑ کر انہیں دیکھنے چلے گئے مگر جو ایک دو لقمے انہوں نے کھائے تھے وہ بھی تھوڑا بہت اثر کر گئے ہیں۔ پرنس کو دو تین بار ''وومٹنگ'' ہوئی ہے مگر شازمینہ اور آنٹی......'' شدتِ غم سے ماہین کی آواز بیٹھ گئی۔

''کون ہو سکتا ہے یہ؟'' عمران نے پوچھا۔

''گارڈز نے خانساماں سمیت تین چار ملازموں کو کمرے میں بند کر دیا ہے، لیکن جس ملازمہ نے کھانا سرو کیا تھا، وہ ابھی تک نہیں ملی۔ پتا ہے وہ کون ہے؟''

میں اور عمران سوالیہ نظروں سے ماہین کی طرف دیکھنے لگے، وہ بولی۔ ''یہ وہی جواں سال حاجن رانی ہے جسے چند روز پہلے پرنس نے تھپڑ مارا تھا۔''

یہ بڑی معنی خیز صورتِ حال تھی۔ میرا تجربہ تھا کہ کئی گھریلو ملازم جن کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے اور وہ پرانے بھی ہوتے ہیں، ان کے اندر خاص قسم کی حساسیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر کسی وقت مالکوں کی طرف سے ان کے ساتھ کوئی اونچ نیچ ہو جائے تو وہ اسے دل پر لے لیتے ہیں اور کبھی کبھی بڑا غیر متوقع ردِعمل ظاہر کر دیتے ہیں۔ یہ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ لگ رہا تھا۔ گرم کافی گرنے اور تھپڑ والے واقعے کے بعد میں نے حاجی رانی نامی ملازمہ کو کم ہی زنان خانے سے باہر دیکھا تھا۔

ماہین نے بتایا۔ ''یہاں میڈیکل ٹریٹ منٹ کا کافی سامان اس لیے موجود ہے کہ بڑے خاقان جی کو اس کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔ ڈاکٹر عظیم اور ڈاکٹر شاہد شازمینہ اور آنٹی وردا کا معدہ واش کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

پرنس بخت کہہ رہے تھے ابھی ان دونوں کی حالت خطرے سے باہر نہیں۔“

ہمیں معلومات فراہم کر کے ماہین پھر رہائشی پورشن کی طرف لپک گئی۔ ہم نے دیکھا گارڈز خاقان ولا کے طول و عرض میں بھاگے پھر رہے تھے۔ یقیناً وہ ملازمہ حاجن رانی کو ہی تلاش کر رہے ہوں گے۔ گھڑسواروں کی ایک ٹولی بھی تیز رفتاری سے مین گیٹ کی طرف جاتی نظر آئی۔

ابھی آٹھ دس منٹ ہی گزرے تھے کہ رہائشی حصے کی طرف جیسے کہرام سا مچ گیا۔ عورتوں کے رونے اور بین کرنے کی بلند آوازیں سنائی دیں۔ میں اور عمران سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ پھر اینکسی کے اشک بار ملازم نوروز نے ہمیں اطلاع دی کہ وردا خانم انتقال کر گئی ہیں اور شازمینہ بی بی کی حالت بھی ٹھیک نہیں۔ وہ گہری بے ہوشی میں ہیں۔

یہ بڑی تکلیف دہ خبریں تھیں۔ جس طرح کی صورت حال بتائی جا رہی تھی، یقیناً شازمینہ کو ان برف پوش پہاڑوں کے بجائے ایبٹ آباد یا راولپنڈی کے کسی اچھے اسپتال میں ہونا چاہیے تھا مگر ایسا ممکن نہیں تھا۔ یہ تاریک رات، دکھ، سردی اور بے یقینی کے کہرے میں لپٹی ہوئی تھی۔

☆☆☆

وردا خانم کے عزیز اس کے جسدِ خاکی کو اسکردو پہنچانا چاہتے تھے جو کسی صورت ممکن نہیں تھا۔ لہٰذا اس خوش پوش، خوش اخلاق خاتون کو امانتاً ذخیرے کے قبرستان میں ہی دفن کر دیا گیا۔ خراب موسم کے باوجود پوری آبادی جنازے میں امڈ آئی۔ یہ ایک طرح سے ہردلعزیز پرنس بخت کی مقبولیت کا ثبوت بھی تھا۔ وردا خانم کا یوں اچانک چلے جانا سب کے لیے بے حد تکلیف دہ تھا۔ خاص طور سے ان کے شوہر (شازمینہ کے والد) کے لیے۔ تدفین کے وقت وہ صدمے سے نڈھال اور نیم جان نظر آتے تھے۔ وہ اپنی بیٹی کے اچھے مستقبل کے لیے بڑے خاقان اور پرنس کے پُرزور اصرار پر یہاں خاقان ولا میں آئے تھے۔ انہیں کیا پتا تھا کہ یہاں اندرانا بیگم جیسی خون آشام بلا موجود ہے جو انہیں نیچا دکھانے کے لیے ہر حد سے گزر جائے گی۔

شازمینہ کے بارے میں ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا۔ ڈاکٹروں نے سرتوڑ کوشش کر کے اس کی سانس بحال رکھی ہوئی تھی۔ وہ کسی وقت تھوڑی سی امید بھی ظاہر کرتے تھے۔ شقی القلب ملازمہ رانی کا ابھی کوئی کھوج نہیں ملا تھا۔ اسے زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا تھا۔ کچھ لوگ یہ شک بھی ظاہر کر رہے تھے کہ شاید وہ ارتکابِ جرم کے بعد پناہ لینے کے لیے بالاٹ چلی گئی ہو۔ تاہم ابھی تک اس کا کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔ ماہین، شازمینہ کے لیے ازحد پریشان تھی۔ اسے رہ رہ کر حاجن رانی پر بھی طیش آتا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ رانی ملازمہ ہونے کے باوجود بڑی اکڑفوں رکھتی تھی۔ یوں ظاہر کرتی تھی جیسے وہ اس گھر کا فرد ہو۔ پرنس سے طمانچہ کھانے کے بعد وہ بالکل گم صم رہنے لگی تھی۔ اپنی کسی ساتھی سے اس نے یہ بھی کہا تھا کہ میرے گھرانے کی برسوں کی چاکری کا یہ اچھا صلہ دیا ہے مالکوں نے۔

میرے بازو کا زخم اب مندمل ہو رہا تھا۔ حالت میں بتدریج بہتری آ رہی تھی۔ لیکن وہ سرخ دھبوں والی ٹمن شمن ابھی برقرار تھی۔ میں قریباً روزانہ ہی اپنا جسم چیک کرتا تھا۔ ڈاکٹر عظیم بھی گاہے بگاہے اس بارے میں پوچھ رہا تھا۔

اس روز پرنس بخت کے سیلائٹ فون کے ذریعے ماہین نے ایک بار پھر لاہور میں بات کی۔ اپنے منگیتر حسام کو بھی اپنے بارے میں تسلی تشفی دی۔ حسام کو گمان تک نہیں تھا کہ یہاں لاہور سے سیکڑوں میل دور ماشر بروم پہاڑ کے نواح میں میرے علاوہ عمران بھی ماہین کے ساتھ موجود ہے۔

میں نے بھی بات کی۔ اپنے ڈی آئی جی صاحب کو اور ساتھی آفیسرز کو اپنی خیرخیریت کے بارے میں بتایا۔ میں نے عمران سے پوچھا کہ کیا وہ بھی انڈیا میں اپنی والدہ یا کسی اور سے بات کرنا چاہتا ہے۔

”نہیں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا۔ ”اب تو ان سے بالمشافہ ہی بات ہوگی۔“

مجھے یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ ماہین کا گریز اور اس کا رویہ دیکھ کر اب وہ واقعی واپسی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچنے لگا ہے۔ یقیناً اس میں کچھ عمل دخل میرے اس اصرار کا بھی تھا کہ وہ چلا جائے۔

وردا بیگم کے جاں بحق ہونے کے چوتھے روز کا واقعہ ہے۔ میں میڈیسن لینے کے بعد کمرے میں ہی تھوڑی سی چہل قدمی کر رہا تھا جب ماہین طوفان کی طرح میرے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ اندرونی جوش سے تمتما رہا تھا۔ دروازہ اور کھڑکیاں بند کر کے بولی۔ ”انکل تابش! مجھے پتا چل گیا ہے آنٹی وردا اور شازمینہ کا مجرم کون ہے۔ حاجن رانی صرف آلۂ کار تھی۔ اصل مجرم وہی باسٹرڈ اندرانا بیگم ہے۔ وہ انتقام میں اندھی ہو رہی ہے۔ اسی نے جان لی ہے آنٹی وردا کی۔“

میں نے حیرت کے جھٹکے سے سنبھلنے کے بعد کہا۔
''ماہین! تم بہت بڑی بات کہہ رہی ہو، کوئی ثبوت ہے تمہارے پاس؟''
''بڑا بولڈ ثبوت ہے انکل۔ کوئی اس کو جھٹلا نہیں سکے گا۔'' وہ ایک یو ایس بی میرے سامنے کرتے ہوئے بولی۔
''اس میں کیا ہے؟'' میں نے پوچھا۔
''رابن چڑیوں کی آوازیں...... اور ووڈ پیکرز کی چہچہاہٹ وغیرہ۔''
''میں اب بھی نہیں سمجھا؟''
ماہین نے بڑے جوشیلے انداز میں بتایا کہ مہمان خانے کے عقب والے باغیچے میں رابن چڑیاں اور کچھ دوسرے پرندے دانہ دنکا چگنے آتے ہیں اور چہکارتے ہیں۔ وہ ان کی دلکش آوازوں کو قریب سے ریکارڈ کرنا چاہتی تھی۔ اس نے ایک وائرلیس مائیک پودوں میں چھپا رکھا تھا۔ آج اس نے اس مائیک سے کی جانے والی ریکارڈنگ چیک کی تو اس میں پرندوں کی آوازوں کے علاوہ بھی کچھ ریکارڈ تھا۔ یہ ریکارڈنگ شام کے بعد تاریکی میں چند دن پہلے ہوئی تھی۔
ماہین نے بڑی تیزی سے اس یو ایس بی کو اپنے لیپ ٹاپ کے ساتھ اٹیچ کیا اور پھر اس آڈیو ریکارڈنگ تک پہنچ گئی جو مجھے سنانا چاہتی تھی۔ یہ جدید ڈیوائس کی خاصی صاف آواز تھی۔ ایک دبی دبی سسکی سنائی دی پھر ایک نسوانی آواز نے کہا۔ ''چھوڑو بھی نوروز خان، یہ کوئی وقت ہے ان حرکتوں کا......'' میں نے پہچان لیا یہ اسی حاجن رانی کی آواز تھی۔
نوروز کی ہانپی ہوئی آواز ابھری۔ ''اوئے! اب پتا نہیں کب ہاتھ آؤ گی تم۔ تھوڑا سا کلیجا ٹھنڈا کر لینے دو۔''
چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر رانی کی آواز سنائی دی۔
''او وکیا کہا تھا اندرانا جی نے؟''
''بس یہی کہ کل کام ہونا چاہیے اور رات والے کھانے میں ہونا چاہیے۔ ویسے بھی کل بجلی کی ہفتہ وار چھٹی ہے۔ تمہیں ''ولا'' سے نکلنے میں بھی آسانی رہے گی......''
سرگوشیوں میں چند فقرے مزید بولے گئے پھر قدموں کی چاپ ابھری اور خاموشی چھا گئی۔ اب بس ہوا کی سائیں سائیں سنائی دے رہی تھی یا رکھوالی کے کتوں کی دور افتادہ آوازیں تھیں۔
ہم نے دو تین بار ''ری وائنڈ'' کر کے ریکارڈنگ سنی۔ یہ واقعی بہت ٹھوس ثبوت تھا۔ یہ بھی واضح ہو رہا تھا کہ اندرانا جان اور ملازمہ رانی جہاں بھی ہیں اس کا علم نوروز کو ہے۔
نوروز خاں کی عمر تیس بتیس سال تھی۔ وہ چھریرے جسم کا گھنی مونچھوں والا بندہ تھا۔ سر کے بال لمبے تھے۔ وہ زیادہ تر انیکسی میں ہی نظر آتا تھا۔ یہاں کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھتا تھا اور دوسرے ملازموں سے کام بھی لیتا تھا۔
ابھی میں اور ماہین بات ہی کر رہے تھے کہ دروازے پر شائستہ دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو سامنے نوروز ہی مسکراتے چہرے کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھوں میں موسم سرما کے نیلگوں پھولوں کا گل دستہ تھا۔ ''جی سرکار! آپ کے لیے تازہ پھول۔'' اس نے ادب سے جھک کر کہا۔
اس شخص کو دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ اتنی گھناؤنی سازش میں ملازمہ رانی کے ساتھ شریک رہا ہے۔

☆☆☆

پرنس بخت بہت شائستہ مزاج شخص تھا مگر بوقت ضرورت وہ بہت سخت بھی ہو جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اپنے علاقے کا نظم و نسق چلانے کے لیے یہ دونوں صفات ضروری تھیں۔ مہمان خانے کے کسی کمرے سے رونے چلانے کی مدھم آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ مردانہ آوازیں تھیں۔ میں اور عمران، جان گئے کہ نوروز کے حوالے سے جو اطلاع ہم نے پرنس کو دی ہے اس کے نتیجے میں نوروز کی شامت آئی ہوئی ہے۔ یقیناً نوروز سے اندرانا بیگم اور ملازمہ رانی کے بارے میں پوچھا جا رہا تھا۔ بالاٹ میں پرنس کے ایک دو جاسوس موجود تھے۔ ان کے ذریعے پرنس نے بڑی اچھی طرح تصدیق کی تھی اور پتا یہ چل رہا تھا کہ اندرانا یا ملازمہ رانی کے بالاٹ میں آنے یا پناہ حاصل کرنے کی کوئی اطلاع نہیں ہے۔ (اندرانا اب اپنی ذاتی رہائش گاہ میں نہیں تھی)
میں عمران کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتا اس کمرے میں پہنچ گیا جہاں نوروز چھت سے الٹا لٹکا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر سفید رنگ کی بس ایک شلوار تھی۔ جسم پر بید کی، ایک لمبی چھڑی کے ان گنت سرخ نشان تھے۔ اس ہال نما کمرے میں پرنس، انچارج گارڈ طالب شاہ اور پرنس کے پھوپی زاد عمر دراز کے علاوہ دو ملازم بھی موجود تھے۔ تنومند ملازم جس کے ہاتھ میں بید کی چھڑی تھی بُری طرح ہانپا ہوا تھا۔ دوسری طرف نوروز کی حالت بھی پتلی تھی۔
انچارج طالب نے معنی خیز نظروں سے پرنس کی طرف دیکھا اور بولا۔ ''مالک، بڑی ڈھیٹ ہڈی ہے۔ ایسے

کچھ نہیں بتائے گا۔"

پرنس بخت نے اثبات میں سر ہلایا۔ دو ملازم انچارج سمیت آگے بڑھے اور انہوں نے الٹے لٹکے نوروز کو چھت سے اتار لیا۔ انہوں نے نائیلون کی موٹی رسی اس کی ٹانگوں سے کھول کر اس کے ہاتھوں میں باندھی تو ایک دم جیسے کوئی بات نوروز کی سمجھ میں آئی اور اس کا رنگ ہلدی ہو گیا۔ وہ اتنے زور سے تڑپا مچلا کہ گارڈز کے لیے اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ بہرحال ایک دو منٹ میں ہی انہوں نے اسے دوبارہ چھت سے لٹکا دیا مگر اس مرتبہ اسے سیدھا لٹکایا گیا تھا۔

نوروز بلتی زبان میں فریاد کناں ہوا۔ "خدا کے لیے نہیں...... خدا رسول کے لیے نہیں......"

"تو پھر بتاؤ، کہاں ہے اندرانا بیگم اور کہاں ہے تمہاری وہ منہ بولی بیوی حاجن رانی؟" پرنس بخت نے مستحکم آواز میں پوچھا۔

"ہم...... مجھے کچھ پتا نہیں۔ انہوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔" وہ بلک کر بولا۔

پرنس نے آنکھوں سے انچارج کو اشارہ کیا۔ اس نے اپنے ماتحتوں کے ساتھ مل کر نوروز کی شلوار کے دونوں پائنچوں کو ڈوریوں کے ذریعے باندھ دیا۔ تب ایک شخص ہاتھ میں ایک چھوٹا پنجرہ لیے برآمد ہوا۔ اس میں بالکل برف کی طرح سفید رنگ کے تین موٹے تازے چوہے تھے۔ ان کی آنکھیں نارنجی رنگ کی تھیں اور وہ بار بار جارحانہ انداز میں اپنے دانت نکوسنے لگتے تھے۔ طالب شاہ کے دونوں ماتحتوں نے تڑپتے پھڑکتے نوروز کی دونوں ٹانگوں کو گھٹنوں کے پاس سے جکڑ لیا اور طالب شاہ نے نوروز کا ازار بند کھول کر تینوں چوہے اندر چھوڑ دیے۔ چند ہی لمحوں میں نوروز کی آہ و بکا فلک شگاف ہو گئی۔ وہ ایسے پھڑک رہا تھا جیسے وحشت میں خود ہی اپنے جسم کے حصے بخرے کرلے گا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی سفید شلوار پر سرخ داغ نمودار ہونے لگے۔ اب صرف نوروز ہی نہیں اس کی شلوار بھی پھڑک رہی تھی۔ ایک منٹ کے اندر اندر نوروز کی ہمت جواب دے گئی۔

وہ گلے پر چھری پھرنے والے بکرے کی طرح چلایا۔ "میں مر جاؤں گا۔ میں بتاتا ہوں۔" انچارج طالب کے دونوں ماتحتوں نے ہاتھوں پر خاص قسم کے دستانے پہن لیے تھے جیسے انہیں پہلے سے معلوم ہو کہ نوروز ہتھیار ڈالنے والا ہے۔

اس کی شلوار کے اندر سے چوہوں کو دبوچ کر باہر نکالا گیا اور پنجرے میں بند کر دیا۔ تاہم نوروز کو اسی طرح لٹکا رہنے دیا گیا۔

نوروز نے کربناک لب و لہجے میں جو کچھ بتایا اس سے تصدیق ہوئی کہ اندرانا اس کی بیٹی زرش اور ملازمہ رانی میں سے کوئی بھی بالاٹ نہیں گیا۔ وہ تینوں ذخیرے کی آبادی سے قریباً تین کلومیٹر آگے "گڑھی" نامی ایک مختصر سی بستی میں موجود تھیں۔ یہ بستی مشکل سے ڈیڑھ دو سو نفوس پر مشتمل تھی۔ ایک طرح سے یہ دونوں متحارب بستیوں یعنی ذخیرے اور بالاٹ کے قریباً درمیان واقع تھی۔ وہاں نوروز کے ایک ماموں کا آبائی گھر کافی عرصے سے خالی پڑا تھا۔ اندرانا بیگم اور زرش اپنے گھر سے نکلنے کے بعد بڑی رازداری کے ساتھ وہیں ٹھہری ہوئی تھیں۔ اب ملازمہ رانی بھی وہیں پدھاری تھی۔ خاقان ولا میں کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتا تھا کہ اندرانا اور زرش، ولا سے صرف تین کلومیٹر کے فاصلے پر ایک چار دیواری میں موجود ہیں۔ پرنس بخت اور اس کے ساتھیوں کا شک کسی بھی طرح نوروز جیسے وفادار ملازم پر نہیں جا سکتا تھا۔ یہ جو کچھ ہوا تھا صرف ماہین کی وجہ سے ہو پایا تھا۔ اس کے کیے ہوئے انکشاف نے سارے پول کھول دیے تھے۔

نوروز سے معلومات حاصل ہونے کے بعد وقت ضائع کرنا بے وقوفی ہی ہوتی۔ فی الفور تین گاڑیاں گڑھی نامی بستی میں جانے کے لیے تیار ہو گئیں۔ عمران کے اصرار پر میں بھی اس کے ساتھ پرنس والی لینڈ روور جیپ میں سوار ہو گیا۔ میں اب چلنے پھرنے کے لائق ہو چکا تھا۔ پختہ اور نیم پختہ راستے پر سفر کر کے گاڑیاں صرف بیس منٹ میں گڑھی نام کی اس برف پوش بستی میں پہنچ گئیں۔ یہاں ڈیزل سے چلنے والے چند آرے لگے ہوئے تھے...... جو اب ویران پڑے تھے۔ موسم گرما میں جنگل کی کٹائی سے حاصل ہونے والی لکڑی کو یہاں مزید کاٹا جاتا تھا۔ بستی کے لوگ پرنس اور اس کے مسلح گارڈز کو دیکھ کر جہاں بہت مؤدب نظر آئے وہاں اس اچانک آمد پر کچھ حیران بھی دکھائی دیے۔ زخمی نوروز کی نشاندہی پر طالب شاہ کی معیت میں مسلح گارڈز تیزی سے اس گھر میں داخل ہوئے جہاں تینوں خواتین موجود تھیں۔ نوروز کے ماموں کا یہ پتھریلا گھر کافی کشادہ تھا اور تین اطراف سے برف پوش چٹانوں میں گھرا ہوا تھا۔ پرنس بخت اور اس کا کزن عمر دراز بھی گاڑی سے اتر کر گھر میں داخل ہو گئے۔ تاہم دو منٹ بعد ہی انچارج طالب کا

ہوا چہرہ دیکھ کر ہمیں اندازہ ہو گیا کہ کوئی گڑبڑ ہے۔

''کیا ہوا طالب شاہ؟'' عمران نے پوچھا۔

''گھر خالی پڑا ہے۔ لگتا ہے کہ ایک ڈیڑھ گھنٹا پہلے اندرانا بیگم سمیت تینوں عورتیں یہاں سے نکل گئی ہیں۔'' انچارج نے انکشاف کیا۔

چند سیکنڈ بعد پرنس بخت بھی جیپوں کی طرف آتا دکھائی دیا۔ وہ ایک باتحمل شخص تھا مگر اس وقت اس کا چہرہ لال بھبوکا ہو رہا تھا۔ یقیناً اس کے غم و غصے کا منبع اس کی سابق ساس ہی تھی۔ اس کی کینہ پروری کی وجہ سے وردا خانم کی جان گئی تھی اور وردا بیگم کی بیٹی شازینہ زندگی اور موت کی کشمکش میں تھی۔

پرنس نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''تابش صاحب! ہم ان کے پیچھے جا رہے ہیں۔ آگے راستہ زیادہ مشکل ہے صرف دو جیپیں ہی جا سکیں گی...... ویسے بھی ابھی آپ پوری طرح ٹھیک نہیں ہیں، آپ یہیں رہیں۔''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ مجھے رکتا دیکھ کر عمران بھی یہیں رک گیا۔ دو گاڑیاں اچھلتی کودتی۔ بالاٹ جانے والے راستے پر ہولیں۔ غالب امکان یہی تھا کہ اندرانا، زرش اور ملازمہ بالاٹ کی طرف ہی گئی ہیں۔ وہاں پرنس کا دشمن اول شنگرے خاناں انہیں پناہ دے سکتا تھا۔ زخمی نوروز، پرنس کے ساتھ ہی روانہ ہوا۔ پرنس کے پانچ چھ مسلح محافظ بھی یہیں ہمارے ساتھ رک گئے تھے۔ میں اور عمران گھر کے اندر پہنچے۔ نوروز کا ماموں کھاتا پیتا شخص لگتا تھا۔ کسی وقت یہ گھر کافی آرام دہ رہا ہوگا لیکن اب ہر طرف ویرانی ہی تھی۔ اس گھر میں ایک تہ خانہ بھی تھا۔ ہم چند زینے اتر کر تہ خانے میں پہنچے تو یہ نیم گرم محسوس ہوا۔ ایک بڑی انگیٹھی کو دیکھ کر پتا چلتا تھا کہ ڈیڑھ دو گھنٹے پہلے تک اس میں آگ روشن رہی ہے۔ تہ خانے میں کھانا پکانے کا انتظام بھی تھا۔ نوروز نے یہاں دو تین ہفتوں کا راشن بھی ڈال دیا تھا جس میں خشک گوشت اور خشک دودھ بھی نظر آ رہا تھا۔ دو آرام دہ بستر تھے۔ ملازمہ رانی غالباً فرش پر بچھے گدے پر سوتی رہی تھی۔ تہ خانے میں مختلف اشیا ادھر اُدھر بکھری ہوئی تھیں۔

عمران نے کہا۔ ''لگتا تو یہی ہے کہ اس منحوس اندرانا کو کسی طرح نوروز کے پکڑے جانے کی خبر مل گئی اور وہ بیٹی اور ملازمہ کے ساتھ منہ اندھیرے یہاں سے نکل بھاگی۔''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ''لیکن یہاں ایک سوال یہ بھی اٹھتا ہے کہ اگر اندرانا نے شنگرے خاناں کے پاس ہی پناہ لینا تھی تو پہلے کیوں نہ لے لی۔ یہاں کیوں چھپی رہی۔''

''ہو سکتا ہے کہ اسے اپنے پکڑے جانے کا سان گمان بھی نہ ہو۔ یہ تو ماہین کی ریکارڈنگ کی وجہ سے ان کی پلاننگ برہم پتر ہوئی۔''

''برہم پتر نہیں، درہم برہم۔'' میں نے تصحیح کی۔

''لیکن میں نے تو فیروز اللغات میں یہی پڑھا تھا کہ پلاننگ برہم پتر ہوتی ہے۔''

''تم جان بوجھ کر اپنی گفتگو میں مشکل لفظ لاتے ہو اور جان بوجھ کر ہی انہیں غلط بھی بولتے ہو۔'' میں نے کراہتے ہوئے کہا اور ذرا دم لینے کے لیے بیڈ پر بیٹھ گیا۔

میری نقاہت دیکھتے ہوئے اس نے اس لایعنی بحث کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا۔ ماتھے پر سلوٹیں ڈال کر بولا۔ ''ویسے جناب! یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خاقان ولا سے نکلنے کے بعد اندرانا نے بالاٹ میں پناہ لینے کا سوچا ہو مگر وہاں شنگرے خاناں وغیرہ نے انکار کر دیا ہو۔ انہوں نے سوچا ہو کہ دشمنی اور بھڑک جائے گی۔''

''ہاں یہ بھی خارج از امکان نہیں ہے۔''

''دیکھیں چاچو! مشکل لفظ تو آپ بھی بولتے ہیں...... لیکن کچھ بھی ہے میں اب آپ کی بات کو ملفوف خاطر (ملحوظ خاطر) رکھوں گا۔''

میں اسے گھور کر رہ گیا۔ وہ میرا موڈ بحال کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر بیماری نے ابھی پوری طرح مجھے اپنے جبڑوں سے نہیں نکالا تھا۔ خاقان ولا سے یہاں تک آنے کی معمولی مشقت نے ہی تھکا دیا تھا۔

پرنس کے جو گارڈز یہاں رہ گئے تھے اُن میں سے دو اوپر صحن میں موجود تھے۔ باقی تین چار گھر کے سامنے پہرا دے رہے تھے اور بستی کے لوگوں کو دروازے سے دور رکھے ہوئے تھے جو اپنے تجسس کی وجہ سے قریب آنا چاہتے تھے۔

سینے میں جلن سی ہونے لگی تھی۔ عمران نے میری طبیعت دیکھتے ہوئے مجھے بستر پر نیم دراز ہونے پر مجبور کر دیا۔ جب میں بستر پر نیم دراز ہوا تو مجھے تہ خانے کی چھت کے قریب واقع مستطیل روشن دان کے باہر کا منظر دکھائی دینے لگا۔ روشن دان پر شیشہ لگا ہوا تھا۔ شیشے کے اس پار اونچے نیچے برف پوش پتھر تھے اور کچھ ٹنڈ منڈ پودے دکھائی دیتے تھے۔ اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں نے ان پتھروں اور پودوں کے بیچ کسی کو حرکت کرتے دیکھا ہے اور

وہ جو کوئی بھی ہے جانور نہیں ہے۔ یوں لگا جیسے وہاں کوئی دبکا ہوا ہے۔

میں نے عمران کو یہ بات بتائی...... پھر ہم دونوں سیڑھیاں چڑھ کر مکان کے عقبی دروازے کے پاس پہنچ گئے۔ عمران نے لوہے کا عقبی دروازہ کھولا تو ایک گارڈ بھی بھاگا ہوا آ گیا۔ ”کیا ہوا صاحب جی؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ہم تینوں احتیاط سے باہر نکلے۔ مطلع ابر آلود تھا اور کچھ دھند بھی محسوس ہوتی تھی۔ ٹنڈ منڈ پودوں اور اونچے نیچے پتھروں میں ہم نے چاروں طرف دیکھا۔ اچانک عمران بجلی کی سی تیزی سے حرکت میں آیا اور اس نے ایک بڑے پتھر کے پیچھے کسی کو دبوچ لیا۔ ایک تیز نسوانی آواز ابھری۔ وہ جو کوئی بھی تھی خود کو عمران سے چھڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔ ہم بھی پہنچ گئے۔ میں بھی عمران ہی کی طرح ششدر رہ گیا۔ عمران نے بکھرے بالوں والی جس خوب صورت لڑکی کو پکڑ رکھا تھا، وہ کوئی اور نہیں پرنس کی سابق بیوی اور اندرانا کی بیٹی زرش جہاں تھی۔ وہ ابھی تک اسی قیمتی لباس میں تھی جس میں چند روز پہلے خاقان ولا سے گئی تھی۔ مجھے اس کے چہرے پر طمانچوں کے گہرے نشان نظر آئے جو غالباً ایک آدھ دن پہلے کے تھے۔ نچلا ہونٹ بھی پھٹا ہوا تھا۔ وہ کچھ بتا کر نہیں دے رہی تھی۔ بس روتی جا رہی تھی۔ کبھی اپنی قبائلی زبان بول رہی تھی، کبھی شکستہ اردو میں واویلا کرنے لگتی تھی۔ کہہ رہی تھی۔ ”مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو...... میں مر جانا چاہتی ہوں......“

اسی دوران میں پرنس بخت اور اس کے ساتھی بھی اندرانا بیگم کی تلاش میں ناکام ہو کر واپس آ گئے۔ پرنس نے زرش جہاں کو ہمارے ساتھ خستہ حالت میں دیکھا تو ششدر رہ گیا۔ دیگر لوگوں کا بھی یہی حال ہوا۔ سب سمجھ رہے تھے کہ زرش اپنی ماں کے ساتھ ہی یہاں سے نکل گئی ہے۔

میں نے ساری بات پرنس کے گوش گزار کی۔ پرنس نے ابھی تک زرش کو مخاطب نہیں کیا تھا، وہ بھی بے رخی سے منہ پھیرے بیٹھی تھی۔ پرنس نے کمرے سے باہر آ کر مجھ سے کہا۔ ”آپ اس سے پوچھیں کہ یہ یہاں کیسے پائی جا رہی ہے؟ اور اسے مارا پیٹا کس نے ہے؟“

میں نے کہا۔ ”ابھی یہ کچھ بھی بتانے کی پوزیشن میں نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ابھی ولا میں چلتے ہیں۔ اسے کچھ پُرسکون ہونے کا موقع دیتے ہیں۔“ پرنس نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

جب میں نے اور عمران نے اسے خاقان ولا میں چلنے کا کہا تو وہ اڑ گئی، بولی۔ ”میں اب اس چار دیواری میں نہیں جاؤں گی۔ میرا اور پرنس بخت آور کا اب کوئی رشتہ نہیں۔“

عمران نے کہا۔ ”تو پھر اب کہاں جاؤ گی؟“

وہ اس بات کا کوئی جواب نہیں دے پا رہی تھی۔ آ کوشش بسیار کے بعد وہ اس حد تک تیار ہو گئی کہ خاقان ولا کے مہمان خانے تک چلی جائے گی...... مگر پرنس یا اس کی فیملی کے کسی رکن کا سامنا ہرگز نہیں کرے گی۔

☆☆☆

پرنس بہت غصے میں تھا۔ اسے زرش جہاں کا خاقان ولا میں آنا بالکل پسند نہیں آیا تھا مگر وہ خاموش اس لیے تھا کہ خود بھی الجھن میں تھا۔ اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنی ماں کے ساتھ کیوں نہیں جا سکی اور اسے مارا پیٹا کس نے ہے؟

شام سے کچھ ہی پہلے پرنس نے مہمان خانے میں مجھے پیغام بھیجا کہ اگر میں آ سکتا ہوں تو تھوڑی دیر کے لیے اس کے پاس نشست گاہ میں آ جاؤں۔ زرش جہاں اس وقت مہمان خانے کے کامن روم میں ماہین کے ساتھ تھی اور ماہین اسے نارمل کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نشست گاہ میں پہنچا تو پرنس وہاں اکیلا تھا اور کمر پر ہاتھ باندھے بے چینی سے ٹہل رہا تھا۔

بند نشست گاہ کی تنہائی میں میرے اور پرنس کے درمیان جو گفتگو ہوئی، وہ نہایت سنگین بھی تھی اور انکشاف انگیز بھی۔ تھوڑی سی تمہید باندھنے کے بعد پرنس نے گمبھیر لہجے میں کہا۔ ”تابش صاحب چند دن کی رفاقت ہے لیکن میں آپ کی بہت قدر کرنے لگا ہوں۔ یقیناً یہ سوال آپ کے ذہن میں بھی شدت سے ابھرتا ہوگا کہ خاقان ولا کو ایک بڑی خوشی ملنے کے بعد آناً فاناً میرے اور زرش جہاں کے درمیان علیحدگی اور طلاق کیسے ہو گئی۔ میں جانتا ہوں اس کے پیچھے جو حقیقت ہے وہ زیادہ دیر چھپی نہیں رہے گی بلکہ...... میرا اندازہ ہے کہ بہت سے لوگ اس بات کی تہ تک پہنچ بھی چکے ہیں۔ لہٰذا میں بھی اسے مزید چھپانا ضروری نہیں سمجھتا۔“ اس نے چند لمحے توقف کر کے ٹھہرے لہجے میں کہا۔ ”ہمارے رشتے کے خاتمے کی وجہ زرش کی بدکرداری ہے...... اس کے بطن میں جو بچہ ہے وہ میرا نہیں ہے۔“

مجھے سب معلوم تھا لیکن اس موقع پر میں نے حیرت ظاہر کرنا ضروری سمجھا۔

پرنس نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''گناہ گار تو وہی ہوتا ہے جو گناہ کرتا ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اس کے پیچھے زرش کی ماں کا بھی بہت ہاتھ ہے۔ وہ اپنے عناد اور بغض میں ہر حد تک جانے والی عورت ہے۔ اس نے ایک عرصے سے شازمینہ اور اس کی والدہ کے لیے خدا واسطے کا بیر پالا ہوا تھا۔ ہر صورت انہیں نیچا دکھانا چاہتی تھی۔ یہ جو بھی شرمناک صورتِ حال پیدا ہوئی اسی عورت کی رذیل خواہش کے سبب ہوئی۔ اس کے بعد وردا خانم کی جان بھی اسی خواہش کی بھینٹ چڑھی۔''

پرنس نے جو کچھ بتایا وہ مجھے پہلے سے معلوم تھا۔ جو معلوم نہیں تھا وہ یہ تھا کہ زرش جہاں کا بھید آخر کس نے کھولا۔ میرے پوچھنے کی نوبت نہیں آئی۔ اس کا جواب پرنس نے خود ہی دے دیا اور یہ جواب اتنا حیران کن تھا کہ میں چند سیکنڈ کے لیے سکتہ زدہ رہ گیا۔ پرنس کی گفتگو سے انکشاف ہوا کہ اپنے گناہ کے بارے میں زرش نے خود پرنس کو بتا دیا۔ آنسوؤں کے سیلاب کے دوران میں اسے مطلع کر دیا کہ وہ جس بچے کے لیے آسیں امیدیں پال رہا ہے اور خوشی منا رہا ہے وہ اس کا بچہ نہیں ہے۔ یہ تھا تو بہت تکلیف، ہمت اور بے باکی والا اعتراف...... لیکن زرش کسی نہ کسی طور یہ کر گزری تھی۔ (اس نے شوہر کو یہ نہیں بتایا تھا کہ یہ کس کا بچہ ہے) اس نہایت سنگین گناہ کے بارے میں جاننے کے بعد پرنس کے لیے ممکن ہی نہ رہا کہ وہ زرش اور اس کی ماں کو چند لمحوں کے لیے بھی اپنے گھر میں برداشت کر سکے۔ اس نے نہایت غم و غصے کے عالم میں انہیں نکل جانے کا کہا تھا۔

پرنس کی گفتگو دکھ آمیز اور نہایت بوجھل کیفیت کی حامل تھی۔ کچھ دیر تک نشست گاہ میں گمبھیر خاموشی طاری رہی۔ پھر پرنس نے کہا۔ ''میں اس عورت کو ایک منٹ کے لیے بھی اپنی چھت کے نیچے برداشت نہیں کر سکتا لیکن میں اتنا ضرور جاننا چاہتا ہوں کہ یہ یہاں کیوں ہے۔ اپنی حرافہ ماں کے ساتھ بالاٹ کیوں نہیں پہنچی؟''

میں نے ذرا چونک کر پرنس کی طرف دیکھا۔ ''آپ کا مطلب ہے کہ زرش کی ماں بالاٹ پہنچ چکی ہے؟''

''ہاں۔'' پرنس نے پُرتپش انداز میں کہا۔ ''وہاں ہمارے انفارمر نے تصدیق کی ہے۔ وہ نمک حرام حاجن رانی بھی اس کے ساتھ ہے۔ شنگرے خاناں ان کو پناہ دے کر بڑا مہنگا سودا کر رہا ہے۔ اس کو قیمت ادا کرنا پڑے گی۔'' پرنس کی بڑی بڑی آنکھوں میں چنگاریاں سی اڑنے لگی تھیں۔ میرے دل نے گواہی دی کہ عنقریب ان برف پوش بلندیوں پر کوئی ہنگامہ ہونے والا ہے۔

☆☆☆

میں مہمان خانے میں واپس پہنچا تو ماہین مسلسل زرش سے مصروفِ گفتگو تھی۔ ماہین میں یہ خوبی تھی کہ وہ ہر کسی کے ساتھ اس کے مزاج اور اس کی سمجھ بوجھ کے مطابق گفتگو کر لیتی تھی۔ ان دونوں کی اجازت سے میں بھی اس گفتگو میں شریک ہو گیا لیکن جب میں نے محسوس کیا کہ میری موجودگی سے ماہین اور زرش کی باہمی کیمسٹری متاثر ہوئی ہے تو میں اٹھ کھڑا ہوا۔ ماہین اچھی کارکردگی دکھا رہی تھی۔

رات آٹھ بجے کے قریب ماہین نے زرش کو تھوڑا سا کھانا کھلانے کے بعد سکون بخش دوا دی، وہ سو گئی تو ماہین میرے کمرے میں آ گئی۔ اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے پاس اہم نیوز ہیں۔

اس نے انکشاف کرتے ہوئے کہا۔ ''انکل تابش! یہ اسٹوری تو ڈرامائی ہوتی جا رہی ہے۔ ہمارا یہ اندازہ درست نکلا ہے کہ زرش جان بوجھ کر اپنی والدہ کے ساتھ بالاٹ نہیں گئی۔ دراصل اندرانا اپنی خباثت میں اتنا آگے بڑھ گئی ہے کہ ماں بیٹی کے رشتے کو پسِ پشت ڈال دیا ہے۔ طلاق کے بعد اندرانا کا رویہ اپنی بیٹی سے بہت برا ہو چکا ہے۔ وہ اسے مارنے پیٹنے سے بھی نہیں چوکتی۔ پہلے خود ہی اس کو غلط راہ پر لگایا اب دن رات اسے کوستی ہے۔''

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''ماہین، اس کے پیچھے ایک وجہ ہے۔ شاید زرش نے وہ تمہیں نہیں بتائی۔ ظاہر ہے کہ بتا بھی نہیں سکتی۔''

ماہین سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اس پر انکشاف کیا کہ اپنی غلط روی اور گناہ کے بارے میں پرنس کو آگاہ کرنے والی زرش خود ہی ہے۔

ماہین کے لیے بھی یہ ایک زبردست بریکنگ نیوز ثابت ہوئی۔ اب بیٹی کے ساتھ اندرانا بیگم کے درشت رویے کی وجہ ماہین کی سمجھ میں آنے لگی تھی۔ بیٹی نے اپنے اندرونی خلفشار سے مجبور ہو کر ماں کا بنا بنایا کھیل تباہ کر کے رکھ دیا تھا...... اور طلاق لے کر عرش سے فرش پر آن بیٹھی تھی۔

میں نے ماہین سے پوچھا۔ ''اندرانا بیگم نے حاجن رانی کے ذریعے وردا خانم اور شازمینہ کو جو زہر دیا اس کے متعلق زرش نے کچھ بتایا؟''

''نہیں انکل! اس سلسلے میں تو وہ میری توقع کے

مطابق بالکل خاموش رہی ہے۔ ہاں اس نے اتنا ضرور کہا ہے کہ وہ اپنی والدہ کی من مانیوں سے عاجز آ چکی ہے۔ اب اس کی والدہ اسے اپنے ساتھ شنگرے خاناں کے ولا میں لے جانا چاہتی تھی۔ وہ جانتی ہے کہ شنگرے خاناں اور اس کے سنگی ساتھی اچھے لوگ نہیں ہیں۔ وہاں ہر مہینے دو مہینے بعد کوئی میلا ہوتا ہے جس میں شراب پی جاتی ہے اور رنگ رلیاں منائی جاتی ہیں۔ زرش کو وہاں جانے سے خوف آ رہا تھا اور اندرانا اس کو ہر صورت لے جانا چاہ رہی تھی۔ عین موقع پر زرش کو تہ خانے سے نکلنے اور قریبی جھاڑیوں میں چھپنے کا چانس مل گیا۔ اس کی والدہ کے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ تا دیر زرش کو تلاش کر سکے..... (اسے اطلاع مل چکی تھی کہ نوروز پکڑا گیا ہے اور خاقان ولا میں اس کی چمڑی ادھیڑی جا رہی ہے۔ وہ یہ بھی جانتی تھی کہ کسی بھی وقت پرنس اور اس کے گارڈز وہاں پہنچ جائیں گے۔ لہٰذا بہ حالتِ شدید مجبوری وہ ملازمہ حاجن کو لے کر وہاں سے نکل گئی۔''

''اب وہ کیا چاہ رہی ہے؟'' میں نے اپنے زخمی بازو کو دباتے ہوئے پوچھا۔

ماہین عجیب نظروں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ ذرا جھجک کر بولی۔ ''انکل تابش! آپ فواد کو دیکھتے رہے ہیں اور بتاتے رہے ہیں کہ وہ زرش کی محبت میں شاید بُری طرح گرفتار ہو چکا ہے..... یہاں زرش کی طرف بھی میں نے کچھ ملتی جلتی بات ہی محسوس کی ہے۔ وہ کھل کر تو کچھ نہیں کہتی مگر مجھے لگتا ہے کہ وہ فواد کے بارے میں سوچتی ہے۔ اس سے ملنا چاہتی ہے۔ وہ یہی سمجھتی ہے کہ وہ ملازمت سے فارغ ہو کر لاہور جا چکا ہے۔ جب میں نے اسے بتایا کہ ہم بھی لاہور سے ہیں تو وہ بار بار مجھ سے لاہور کے بارے میں پوچھنے لگی..... وہ کتنی دور ہے..... وہاں کیسے جایا جا سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ مجھے محسوس ہوا ہے کہ اس کے اندر اس حوالے سے کچھ شدید چل رہا ہے۔''

یہ ساری صورتِ حال حیران کن اور سبق آموز تھی۔ ایک انا پرست عورت نے کسی کو نیچا دکھانے کے لیے ایک سازش بنی اور خود اس کی خوب صورت بیٹی اس سازش کے تانے بانے میں پھنس گئی۔ وہ نہ صرف عالیشان خاقان ولا سے محروم ہوئی بلکہ اب وہ ایک عام سے اسکول وین ڈرائیور کے پیچھے اس کے شہر لاہور میں جانا چاہتی تھی۔ وہ اپنے جسم کو اور جسم میں پلنے والے بچے کو اس شخص سے منسوب سمجھنے لگی تھی۔ یہ کتنی بڑی سزا تھی اس انا پرست، منتقم المزاج عورت کے لیے جس کو اندرانا بیگم کہا جاتا تھا۔

☆☆☆

خاقان ولا میں کشیدگی سی محسوس ہو رہی تھی۔ کئی چہروں پر غم و غصہ بھی نظر آتا تھا۔ اس کی دو وجوہات تھیں۔ پہلی تو یہ کہ شنگرے خاناں نے بالاٹ میں اس عورت کو پناہ دی تھی جس نے یہاں وردا بیگم کو قتل کرایا تھا اور جواں سال شازمینہ کو نازک حالت میں بستر پر ڈال دیا تھا۔ دوسری وجہ کے لیے الٹا چور کوتوال کو...... والا محاورہ استعمال کیا جا سکتا تھا۔ بالاٹ والوں کی طرف سے الزام لگایا گیا تھا کہ اندرانا بیگم کی بیٹی کو طلاق دینے کے بعد پرنس بخت نے زبردستی اپنے پاس روکا ہوا ہے، بلکہ حبسِ بیجا میں رکھا ہوا ہے۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے لگ رہا تھا کہ شاید ایک آدھ دن میں یہاں کوئی تصادم ہو جائے گا۔ بہرحال یہاں کی ''پنچایت ٹائپ باڈی'' بھی متحرک تھی جس میں دونوں بستیوں کے معززین شامل تھے۔

آج میں نے جو تھوڑی بہت چلت پھرت کی تھی اس نے مجھے بہت تھکا دیا تھا..... رات کو پورا جسم پھوڑے کی طرح دکھنے لگا۔ میں قہوہ پی کر لیٹ گیا۔ کچھ سکون محسوس ہوا۔ بس پیٹ پر ناف کے پاس جلن سی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے یونہی سویٹر اٹھا کر دیکھا اور دل دھک سے رہ گیا۔ پیٹ کے زیریں حصے پر وہی سرخ داغ نظر آ رہے تھے جن کے خطرے سے چند روز پہلے ڈاکٹر عظیم نے آگاہ کیا تھا۔

''اوہ خدایا۔'' میرے ہونٹوں سے بے ساختہ نکلا۔

میں اٹھ کر بیٹھ گیا اور روشنی کی طرف رخ کر کے دھیان سے دیکھنے لگا۔ قریباً دس انچ مربع جگہ پر یہ نشانات غیر معمولی تھے اور میرے لیے شدید خطرے کی گھنٹی بجا رہے تھے۔ اسی دوران میں دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ میں نے جلدی سے سویٹر نیچے گرا دیا اور سیدھا ہو کر لیٹ گیا۔ ''آ جاؤ۔'' میں نے کہا۔

عمران ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں اس کا اسمارٹ فون تھا۔ ''یہ دیکھیے چاچو..... نوروز کا کارنامہ۔'' اس نے موبائل کی اسکرین میرے سامنے کی۔

بڑے کرنسی نوٹوں کی تین گڈیاں اور سونے کے چار بسکٹ نظر آ رہے تھے۔ ''یہ کیا ہے؟'' میں نے خود کو کمپوز کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ وہ رشوت کا مال ہے جناب، جو نوروز خاں سے برآمد ہوا ہے اور جو اندرانا بیگم نے اسے اور ملازمہ رانی کو دیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے اس کے کپڑوں میں پھر برفانی

جو بے چھوڑنے کی دھمکی دی گئی تھی۔ اس کے نتیجے میں اس نے یہ سب کچھ برآمد کرایا۔"

"مجھے تو لگتا ہے عمران کہ یہ بندہ ضرور بالاٹ والوں کے لیے مخبری بھی کرتا ہوگا۔"

"پچاس فیصد تک یہ بات بھی مان رہا ہے جی۔ بہت کائیاں شخص ہے۔ اب یہ زہر والی سازش ہی دیکھیں کتنی ہوشیاری سے تیار کی گئی۔ پہلے سوچی سمجھی پلاننگ کے مطابق حاجن رانی نے شازینہ پر گرم کافی گرائی اور پرلس سے تھپڑ کھایا۔ پھر اس واقعے کو تفتیش کا رخ غلط سمت میں موڑنے کے لیے استعمال کیا گیا..... یہ تو بھلا ہو جی آپ کی بھتیجی کا جس نے نوروز اور رانی کی گفتگو پکڑی، ورنہ کسی کا دھیان ہی نہیں جانا تھا اندرانا بیگم کی طرف، اب نوروز اس سارے منصوبے کا اعتراف کر رہا ہے۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں عمران کی باتیں تو سن رہا تھا مگر دھیان اسی سنگین معاملے کی طرف تھا جو ابھی ابھی مجھ پر آشکار ہوا تھا..... میرے پیٹ کے سرخ داغ۔

اسی دوران میں دروازہ کھلا اور میرے اندر کی اتھل پتھل کچھ اور بڑھ گئی۔ ماہین اپنے خوب صورت بالوں کو لہراتی ہوئی اندر داخل ہوئی اور عمران کو میرے پاس دیکھ کر ذرا جھجک گئی۔ ماہین کے ہاتھوں میں بڑی پلیٹ کے اندر ایک خوش رنگ کیک تھا جو اس نے خود کچن میں تیار کیا تھا۔ کیک کے ساتھ ایک شمع بھی روشن تھی۔

"یہ کس لیے؟" میں نے پوچھا۔

"آپ کی صحت یابی کی خوشی میں۔ چھوٹا سا کیک چھوٹی سی تقریب۔" وہ اٹھلائی۔

میں دل مسوس کر رہ گیا۔ جب آپ کے پیارے آپ کو صحت مند سمجھ رہے ہوں اور آپ صحت مند نہ ہوں، اندر سے کسی بیماری میں جکڑے ہوئے ہوں تو چہرے پر خوشی کے تاثرات سجانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ بہرحال ماہین نے کیک کاٹا۔ تھوڑا سا مجھے کھلایا، تھوڑا سا عمران کی طرف بڑھایا۔ بہرحال وہ دونوں ایک دوسرے سے کھنچے ہوئے تھے۔ کوئی بہت ضروری بات ہی ہوتی تو کرتے تھے۔ ماہین تو خاص طور سے عمران سے کنی کترا رہی تھی۔

کیک وغیرہ کٹ گیا۔ مجھے اپ سیٹ دیکھ کر وہ زیادہ دیر میرے پاس نہیں بیٹھے۔ پہلے ماہین ہی گئی۔ اسے ویسے بھی زرش کے پاس پہنچنا تھا۔ میں آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا۔ کبھی دل چاہ رہا تھا کہ ڈاکٹر عظیم کو بلاؤں اور اسے اس پُراندیش صورت حال سے آگاہ کروں، کبھی سوچتا تھا کہ فی الحال خاموش رہوں۔

رات جیسے تیسے گزری۔ اگلے روز دیکھا، نشان اوپر کی طرف مزید پھیل گئے تھے اور رنگ بھی نسبتاً گہرا ہو گیا تھا۔ متاثرہ حصے میں جلن بھی شدید تھی۔ میں اٹھ کر کمرے کے اندر ہی ٹہلتا رہا، پھر ایک شال لپیٹ کر باہر آ گیا۔ سردی گرمی مجھ پر زیادہ اثر نہیں کرتی تھی مگر چونکہ آج کل بیماری کے زیرِ اثر تھا اس لیے احتیاط کر رہا تھا۔ دسمبر کی آخری تاریخوں کا سورج دھند کی چادر کے اندر سے جھلک دکھانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ لان کی دوسری جانب ایک برآمدے میں غنچہ کی جھلک نظر آئی۔ وہ لان کی طرف ہی آ رہی تھی مگر مجھے دیکھ کر اس نے ایک دم رخ بدلا اور غڑاپ سے ایک راہداری میں اوجھل ہو گئی۔ باتھ روم سے نکل بھاگنے والے واقعے کے بعد سے اس نے اپنی شکل نہیں دکھائی تھی۔ عمران کی حکمتِ عملی نے غنچہ پر سے "طوفانی محبت" کا بخار اتارنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

میں برآمدے میں رکھی ایک آرام کرسی پر بیٹھ گیا۔ صبح کی ان اولین گھڑیوں میں خاقان ولا میں خاموشی محسوس ہوتی تھی مگر یہ خاموشی کسی بڑی ہلچل کا پیش خیمہ بھی ہو سکتی تھی۔ دفعتاً میری نگاہ مہمان خانے کے ایک ٹیرس کی طرف اٹھ گئی۔ وہاں کمرے کے سامنے کوئی بیٹھا تھا۔ اس نے ہلکا گلابی لباس پہن رکھا تھا اور اداسی بھرے انداز میں اپنا سر ستون کے ساتھ ٹکایا ہوا تھا۔ یہ کوئی اور نہیں زرش جہاں ہی تھی۔ وہ ایسے زاویے سے بیٹھی تھی کہ مجھے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کے لمبے ریشمی بال کرسی سے نیچے لٹک کر فرش کو چھوتے محسوس ہوتے تھے۔ وہ کسی پینٹنگ کی طرح نظر آتی تھی۔ شاید ماہین نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ جو آگ فواد کے سینے میں بھڑک رہی ہے اس کی بہت سی چنگاریاں اڑ کر زرش کے سینے میں بھی پہنچ چکی ہیں۔ وہ خود کو اس شخص سے منسلک سمجھنے لگی ہے جس کے ساتھ اس نے پُرحرارت قربت کی کچھ راتیں بسر کی ہیں اور جس کی نشانی اب اس کے جسم میں ہے۔ وہ جانتی نہیں تھی کہ وہ یہاں خاقان ولا میں جس کی جدائی کو بری طرح محسوس کر رہی ہے، وہ یہاں سے فقط دو کلو میٹر کی دوری پر شام بستی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں موجود ہے۔

اسی دوران میں ہلکی سبز وردیوں والے چند گارڈز آئے اور زنان خانے کی طرف جانے والا راستہ بلاک کر دیا۔ انچارج گارڈ طالب شاہ نے وہ بڑا گیٹ بھی بند کر دیا جو زنان خانے یعنی رہائشی حصے کو باقی عمارت سے جدا کرتا

تھا۔ یہ صورتِ حال کچھ چونکا دینے والی تھی۔ اسی دوران میں مجھے ماہین زنان خانے کی طرف سے آتی دکھائی دی۔ وہ ہر صبح سب سے پہلا کام یہی کرتی تھی کہ شازمینہ کی عیادت کو جاتی تھی۔ شازمینہ کی حالت زہرخورانی کے بعد ابھی تک سنبھلنے میں نہیں آرہی تھی۔ وہ زیادہ تر نیم بے ہوشی کی کیفیت میں رہتی تھی۔ اسے ابھی تک اس کی پیاری والدہ کی موت کی خبر نہیں دی گئی تھی۔

میں نے ماہین سے پوچھا۔ ''یہاں یہ اضافی سیکیورٹی کیوں نظر آرہی ہے؟''

وہ کرسی گھسیٹ کر میرے بالکل قریب لے آئی۔ ''انکل! ولا میں یہ خبر گردش کررہی ہے کہ اندرانا کی خباثت کا سلسلہ رکنے میں نہیں آرہا۔ اس نے کسی شخص کو بہت زیادہ بھاری رشوت اس بات کے لیے دی ہے کہ وہ کسی بھی طرح بیمار پڑی شازمینہ کو اس کی والدہ کے پاس پہنچا دے۔ دوسرے لفظوں میں شازمینہ کو جان کا شدید خطرہ ہے اور یہ ساری سیکیورٹی پرنس کے حکم پر اسی کے لیے ہے، زنان خانے میں موجود تمام سرونٹس کو بھی تبدیل کردیا گیا ہے...... کچھ اور اقدامات بھی کیے گئے ہیں۔''

''اس خطرے کا کوئی ٹھوس ثبوت بھی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کہا بھی جارہا ہے کہ یہ اطلاع بڑے باوثوق ذرائع سے ملی ہے مگر شازمینہ پر یہ حملہ کیسے اور کس ذریعے سے ہوگا یہ ابھی واضح نہیں ہے۔''

لگتا یہی تھا کہ اندرانا کے پاس نقدی اور سونے کی شکل میں کافی سرمایہ موجود ہے۔ وہ اس کے بل بوتے پر اپنے ناپاک ارادوں کی تکمیل چاہ رہی ہے۔ خاجن رانی اور نوروز خان کو بھی اسی طرح دولت کی چمک سے اندھا کیا گیا تھا۔ نوروز کے پاس سے سونے کے چار بسکٹ ملے تھے۔ میرے اندازے کے مطابق ہر بسکٹ کا وزن سو گرام تھا اور ان کی ٹوٹل قیمت لگ بھگ سولہ لاکھ تھی۔

وہ بڑا تناؤ بھرا دن تھا...... ایک تو میرے پیٹ پر نمودار ہونے والے سرخ نشان تھے جن کے متعلق میں نے ابھی تک کسی کو نہیں بتایا تھا۔ دوسری وجہ وہ ٹینشن تھی جو ہر پل پرنس بخت اور شنگرے خاناں کے درمیان بڑھ رہی تھی۔ وہی کچھ ہورہا تھا جس کا اندیشہ تھا۔ پرنس کا کہنا تھا کہ اندرانا اور ملازمہ رانی ان کی مجرم ہیں، انہیں فوراً حوالے کیا جائے۔ دوسری طرف شنگرے خاناں کہہ رہا تھا کہ اندرانا بیگم کی بیٹی کو زبردستی خاقان ولا میں رکھا گیا ہے اسے چھوڑا جائے۔

پرنس نے مجھ سے جس کام کا کہا تھا وہ ماہین نے کردیا تھا۔ یعنی ہمیں معلوم ہوچکا تھا کہ زرش جہاں اپنی ماں کے ساتھ بالاٹ کیوں نہیں گئی اور ماں کا سلوک اس کے ساتھ کیا رخ اختیار کرچکا ہے۔ سہ پہر کو میں نے نشست گاہ میں جاکر پرنس کو یہ ساری بات بتائی۔ جس وقت ہم دونوں میں یہ گفتگو ہورہی تھی، وہ کچھ ہوگیا جس کا اندیشہ صبح سے محسوس کیا جارہا تھا۔ انچارج طالب شاہ تیزی سے اندر داخل ہوا۔ اس کے چوڑے چہرے پر ہیجانی کیفیت تھی۔ اس نے سیلوٹ کرنے والا انداز اختیار کیا اور بولا۔ ''پرنس! ہم پر حملہ ہوا ہے، بالاٹ والوں نے ہم پر فائرنگ کی ہے۔ آپ کے پھوپی زاد جناب عمر دراز زخمی ہوئے ہیں۔ ہمارے دو بندے موقع پر شہید ہوگئے ہیں۔''

پرنس کسی تند بگولے کی طرح اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کے سرخ و سپید چہرے پر جیسے بجلیاں سی کوند گئی تھیں۔ اس نے دیوار سے لٹکی ہوئی اپنی سیون ایم ایم رائفل اتاری۔ گولیوں والا بیگ کندھے سے لٹکایا اور طالب شاہ کے ساتھ تیزی سے باہر نکل گیا۔ مجھے پرنس کے چچا سلمان صاحب کی آواز سنائی دی۔ غالباً وہ پرنس کو تحمل اور ہوش مندی کا مشورہ دے رہے تھے۔

میں بھی نشست گاہ سے نکل آیا۔ خاقان ولا کی کھڑکیوں میں خواتین خانہ کے ہراساں چہرے نظر آرہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد میں اور عمران دیکھ رہے تھے کہ مسلح گارڈز سے کھچاکھچ بھری ہوئی قریباً چھ جیپیں مین گیٹ سے نکل رہی ہیں۔ کچھ مزید گاڑیاں بھی حرکت میں آرہی تھیں۔ دور شمال مشرق کی طرف بلندی پر فائرنگ کی مدھم آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ یہ دو بستیوں میں نہیں بلکہ دو قبیلوں میں دوبدو لڑائی کا ماحول بن گیا تھا۔ بلند پہاڑوں میں گھری ہوئی برف پوش بلندیوں پر سارا دن فائرنگ کی آوازیں گونجتی رہیں۔ دونوں طرف سے کئی طرح کے چھوٹے ہتھیار استعمال کیے جارہے تھے۔

شام کو عمران نے مجھے خبر دی۔ ''پرنس کا زخمی ہونے والا پھوپی زاد جانبر نہیں ہوسکا۔ معاملہ اور سنگین ہوگیا ہے۔ ایک لاش اور دو تین زخمی بھی اوپر سے لائے گئے ہیں۔ دونوں طرف کے گن مینوں نے آمنے سامنے پوزیشن لے رکھی ہے۔''

''پرنس کہاں ہے؟''

''وہ بھی لڑائی والی جگہ پر ہی ہے۔ میں اس سے مل کر آیا ہوں۔ بالاٹ والے بلندی پر ہیں اس لیے ان کا پلّا کچھ

بھاری نظر آتا ہے۔ میرے اندازے کے مطابق ان کے کم از کم ڈیڑھ سو بندے میدان میں ہیں۔''

''اور پرنس کی نفری؟''

''یہ بھی سو سے اوپر ہی ہوں گے۔ انہوں نے بڑی دلیری سے وہ راستہ روکا ہوا ہے جو شنکرے اور اس کے ساتھیوں کو ذخیرے کی طرف لا سکتا ہے۔ شاید بالاٹ والے اس ہلے میں متنازعہ پہاڑی پر بھی قبضہ جمانا چاہتے ہیں...... بہرحال ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی چاچو...... کیا یہاں قانون کی عملداری نہیں ہے؟''

''عمل داری تو ضرور ہوگی لیکن تم دیکھ ہی رہے ہو اس موسم میں یہ علاقہ ازدگرد سے بالکل کٹ کر رہ گیا ہے۔ اب کیا قانون اور کیسی عملداری؟ اب تو ان لوگوں کو... خود ہی فیصلہ کرنا ہے۔''

''اور وہ جرگہ، پنچایت وغیرہ؟''

''ہوسکتا ہے کہ وہ لڑائی روکنے کی کوشش کر رہے ہوں۔''

اچانک لڑائی والے مقام کی طرف سے ایک زوردار آواز آئی۔ ''یہ کیا ہے؟'' عمران نے چونک کر پوچھا۔ ''دستی بم وغیرہ تو نہیں لگتا۔''

''نہیں...... میرے خیال میں یہ راکٹ لانچر تھا۔''

''اوہ!'' عمران نے ہونٹ سکیڑے۔ ''یہ اڑتی اڑتی سی خبر میں نے بھی سنی ہے کہ بالاٹ والوں کے پاس درمیانے سائز کے کچھ راکٹ لانچر بھی ہیں۔''

اسی دوران میں خاقان ولا کے رہائشی حصے کی طرف سے خواتین کے رونے دھونے کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔

''میرا خیال ہے کہ پرنس کے کزن کی موت کی خبر اب اندر پہنچی ہے۔'' عمران نے کہا۔

یہ آوازیں سن کر ماہین بھی چلی آئی۔ وہ صورتِ حال جاننے کے لیے رہائشی حصے کی طرف بڑھی تو وہاں موجود مستعد گارڈز نے بڑے ادب کے ساتھ اسے روک دیا۔ انہوں نے ماہین کو بتایا کہ پرنس کی طرف سے سخت ہدایات ہیں۔ خصوصی اجازت کے بغیر کوئی بھی اندر نہیں جا سکتا اور نہ باہر آ سکتا ہے۔

یہ سب کچھ اس خفیہ انفارمیشن کی وجہ سے تھا جو پرنس کو ملی تھی اور جس میں بتایا گیا تھا کہ اندرانا، کسی کو بھاری رشوت دے کر شازمینہ کو مروانا چاہتی ہے البتہ ابھی تک اس سازش کا کوئی مہرہ سامنے نہیں آسکا تھا۔ رات کو میرے پیٹ کے سرخ نشانات کی جلن بہت بڑھ گئی۔ میں نے سوچا کہ اب ڈاکٹر عظیم کو بتا دینا چاہیے کہ یہ معاملہ پیش آچکا ہے۔ میں نے ایک ملازم کو بھیجا کہ ڈاکٹر کو بلا لائے۔

اس نے چند منٹ بعد واپس آکر بتایا۔ ''جناب! ڈاکٹر صاحب تو درے (لڑائی والی جگہ) پر ہیں۔ وہاں ایک اور گارڈ شہید ہوا ہے، دو تین زخمی بھی ہیں۔ وہ ان کی دیکھ بھال کر رہے ہیں۔''

اپنی اس تکلیف کے بارے میں، میں عمران اور ماہین کو بتانا نہیں چاہتا تھا۔ انہیں بتانے سے اس کے سوا حاصل بھی کیا تھا کہ وہ تشویش میں مبتلا ہو جاتے۔

اگلے روز بھی سارا دن لڑائی جاری رہی۔ شام تک چار لاشیں مزید خاقان ولا میں پہنچ گئیں۔ تاہم کل شام کے بعد کسی راکٹ لانچر کا دھماکا سنائی نہیں دیا تھا۔ زیادہ تر آٹومیٹک اور سیمی آٹومیٹک رائفلیں استعمال ہو رہی تھیں۔ وقفے وقفے سے کلاشنکوفوں کے مہلک قہقہے بھی سنائی دیے جاتے تھے۔ شام کو ماہین نے مجھے آکر بتایا کہ زرش نے موجودہ صورتِ حال کی بہت ''اسٹریس'' لے رکھی ہے۔ حالانکہ وہ جس حالت میں ہے اسے زیادہ ''اسٹریس'' نہیں لینی چاہیے۔''

''کیا کہہ رہی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''روتی چلی جا رہی ہے۔ کہہ رہی تھی کہ اگر یہ لڑائی میرے بالاٹ جانے سے رک سکتی ہے تو میں جانے کے لیے تیار ہوں میں۔ مجھے اب مرنا ہی ہے۔ یہاں مروں یا بالاٹ میں۔ میں نے اسے سمجھایا کہ وہ ایسی مایوسی کی باتیں مت کرے۔ اسے زندہ رہنا ہے۔ اپنے ہونے والے بچے کے لیے زندہ رہنا ہے۔ اور ویسے بھی وہ اکیلی اس لڑائی کی وجہ نہیں اور بھی کئی وجوہات ہیں۔ میری اس بات سے وہ کچھ نارمل تو ہوئی مگر پھر اس طرح کی باتیں کرنے لگی...... بالکل بے سروپا......''

''مثلاً کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''بار، بار کہنے لگی، میں لاہور جا کر بھی کیا کروں گی۔ انہوں نے اسے مار دیا ہوگا۔ انہوں نے اسے نہیں چھوڑا ہوگا...... میں نے پوچھا، کس کو مار دیا ہوگا۔ اس کا کوئی جواب نہیں دیا...... اور مجھے جھڑکیاں دینے لگی کہ میں کیوں ہر بات کے پیچھے پڑتی ہوں۔ بال کی کھال اتارتی ہوں۔''

''اس کی باتوں سے کیا اندازہ ہوتا ہے تمہیں؟''

''یوں لگتا ہے انکل! کہ وہ فواد سے ملنا چاہتی ہے...... کم از کم ایک بار تو...... ضرور ملنا چاہتی ہے...... اور اسے یہ ڈر

بھی ہے کہ کہیں اس کی ماں نے اسے مروا ہی نہ دیا ہو۔"
آن چاہے تعلق سے شروع ہونے والی یہ محبت کی عجیب کہانی تھی جو سامنے آرہی تھی۔ ماہین کی باتوں سے یہ پتا بھی چلا کہ زرش اپنی ماں کے برعکس حساس طبع رکھتی ہے۔ وہ اس بات پر بھی دکھی ہے کہ شازمینہ کی حالت سنبھلنے میں نہیں آرہی۔ ایک طرف یہ سب چل رہا تھا اور دوسری طرف بستی سے صرف تین چار کلومیٹر کے فاصلے پر رائفلیں شعلے اُگل رہی تھیں۔

رات کو دو ڈھائی بجے تک تو فائرنگ کی آوازیں ہلکی ہی رہیں مگر پھر ایک دم جیسے طوفان سا آگیا۔ دونوں طرف سے اندھا دھند فائرنگ ہونے لگی، دستی بموں کے دھماکے بھی سنائی دیے۔ پھر یوں محسوس ہوا کہ آوازیں قریب آتی جارہی ہیں۔ ولا کے بہت سے لوگوں کی طرح عمران اور ماہین بھی جاگ گئے۔ عمران نے سنسنی خیز لہجے میں کہا۔ "محسوس ہورہا ہے کہ بالا ست والے آگے بڑھ رہے ہیں۔"

ماہین مجھ سے مخاطب ہو کر بولی۔ "ابھی میں نے ٹیرس سے دیکھا ہے فائرنگ کے شعلے نظر آرہے ہیں جو پہلے نہیں تھے۔"

"اس کا مطلب ہے پرنس اور اس کے ساتھی پیچھے ہٹ رہے ہیں۔" میں نے کہا۔

صبح تک سب جاگتے رہے۔ چھ سات مزید لاشیں اور زخمی بھی ولا میں پہنچے...... گولیوں کی آوازیں اب صرف ڈیڑھ دو کلومیٹر کی دوری پر تھیں۔ اجالا ہوتے ساتھ ہی فائرنگ تھم گئی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ لڑائی کے بعد ایک وقفہ تھا۔ اسی دوران میں یہ تکلیف دہ اطلاع بھی ولا میں پھیل گئی کہ پرنس بخت آور سخت زخمی ہو چکا ہے۔

صورتِ حال دیکھتے ہوئے مجھے اور عمران کو لگا کہ اب ولا میں ٹھہرے رہنا کسی طور مناسب نہیں۔ ماہین کو شازمینہ کے بارے میں ضروری ہدایات دے کر میں اور عمران مین گیٹ کی طرف آگئے۔ دو لوڈر جیپیں، لڑنے والوں کے لیے ایمونیشن اور کھانے پینے کا کچھ سامان لے کر جارہی تھیں۔ ہم بھی ایک جیپ میں سوار ہو گئے۔

قریباً بیس منٹ بعد ہم اس مقام پر تھے جہاں یہ قبائلی معرکہ جاری تھا۔ وہاں پہنچتے ہی ایک بہتر خبر ملی کہ پرنس شدید زخمی نہیں تھا۔ اس کے ایک ہاتھ پر کچھ چھرے لگے تھے اور وہاں ڈاکٹر شاہد نے پٹی باندھ دی تھی۔ وہ لڑنے مرنے کے لیے پُرعزم نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آگ روشن تھی۔ وہ مجھ سے اور عمران سے مخاطب ہو کر بولا۔ آپ دونوں کو یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ آپ ہمارے مہمان ہیں...... اور آپ تو ابھی پوری طرح ٹھیک بھی نہیں ہوئے۔" اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

میں نے جواب دیا۔ "پرنس! جو صورتِ حال ہے اسے دیکھتے ہوئے ہم پیچھے نہیں رہ سکتے۔"

"صورتِ حال ایسی بری بھی نہیں ہے۔" پرنس نے کہا۔ "ہم پیچھے ضرور آگئے ہیں لیکن آپ نے ایک بات نوٹ کی ہوگی۔ اب شنگرے خاناں کے لوگ بلندی پر نہیں ہیں اور نہ ہم نشیب میں ہیں۔ یہاں میدان ہموار ہے۔"

"مگر پرنس...... یہاں سے خاتان ولا کا فاصلہ بمشکل دو کلومیٹر ہوگا۔"

"آپ کی بات ٹھیک ہے...... لیکن شنگرے جانتا ہے اس سے آگے بڑھنے کے لیے اسے اپنی بہت سی جانیں گنوانا پڑیں گی۔ دونوں طرف کا سخت نقصان ہوگا...... اب اسے سوچنا پڑے گا۔"

پرنس نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ صرف آدھے گھنٹے بعد پتا چلا کہ جرگے والوں نے عارضی طور پر لڑائی روک دی ہے اور کوئی اہم فیصلہ کررہے ہیں۔ پہلے دو تین معزز افراد شنگرے خاناں کے پاس پہنچے...... پھر وہ علیحدگی میں پرنس سے ملے۔ بڑی بڑی پگڑیوں والے یہ عمر رسیدہ قبائلی کسی بھی طرح بڑا خون خرابا روکنا چاہتے تھے۔ اس پنچایت نما جرگے کے "سرپنچ" کو یہاں "بڑا ملک" کہا جاتا تھا۔ اس کے بارے میں ہم نے سنا تھا کہ اس کی عمر ایک سو پانچ سال ہے۔ بہرحال وہ ہمیں کہیں نظر نہیں آیا۔

ان مذاکرات کے دوران میں ایک بار ہم نے دور سے شنگرے خاناں کو بھی دیکھا۔ وہ درمیانی عمر کا ایک کیم شیم شخص تھا۔ ایک برف پوش چٹان کے پاس کھڑا تھا۔ ایک گارڈ سے ٹیلی اسکوپ لے کر میں نے دیکھا۔ اس کے جسم پر گولیوں والی بیلٹس تھیں، دائیں بائیں دو ہولسٹر لٹک رہے تھے۔ اس کی آنکھوں کے نیچے شراب نوشی کے نمایاں ابھار نظر آتے تھے۔ اس کے نقوش دیکھ کر ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ وہ ایک عیاش اور رنگ باز قسم کا شخص ہے۔

سہ پہر تک یوں محسوس ہوا کہ حالات کچھ سنبھل گئے ہیں۔ پھر ایک عجیب فیصلے کی بازگشت سنائی دینے لگی۔ معلوم ہوا کہ جرگے والوں نے خون خرابا روکنے کے لیے "محالہ" کا فیصلہ کیا ہے۔ "محالہ" یہاں کی پرانی روایت تھی۔ جب کوئی دو برادریاں یا قبیلے آمنے سامنے ہو جاتے تھے اور مارا ماری کی نوبت آجاتی تھی تو اس لڑائی کا فیصلہ کبھی کبھی محالہ نامی رسم

سے بھی کیا جاتا تھا۔ دونوں متحارب گروہ اپنا ایک سب سے بہتر آدمی میدان میں اتارتے تھے۔ ان دونوں میں ''مرو یا مارو'' کا مقابلہ ہوتا تھا۔ جو جیت جاتا تھا۔ اس کا گروہ یا اس کی جماعت بھی فاتح تصور ہوتی تھی۔

اب دوپہر ہونے والی تھی، بلکہ ہو چکی تھی۔ دوپہر کے بعد موسم ان بلندیوں پر اکثر خراب ہو جاتا تھا۔ اب سورج بادلوں میں گم ہو چکا تھا۔ میں اور عمران دیکھ رہے تھے کہ یہاں کوئی کھچڑی سی پک رہی ہے۔ سرمئی پگڑیوں والے بیچ حضرات بھی مخالف گروپ کی طرف جاتے تھے۔ کبھی پرنس وغیرہ کی طرف آتے تھے۔ پرنس کا چہرہ غصے سے سرخ نظر آنے لگا تھا۔

عمران نے کہا۔ ''میں سن گن لیتا ہوں، کیا معاملہ چل رہا ہے؟''

''دھیان سے۔'' میں نے کہا۔ ''فائرنگ رکی ہوئی ہے لیکن اوٹ میں رہنا۔''

عمران نے اثبات میں سر ہلایا اور گاڑیوں اور پتھروں کی اوٹ لیتا ہوا وہاں پہنچ گیا جہاں ایک بڑی برف پوش چٹان کے پیچھے پرنس اور اس کے ساتھیوں نے پوزیشن لے رکھی تھی۔ میں ایک جیپ کے اندر ہی سیٹ کو اسٹریچ کر کے بیٹھا رہا۔ پرنس کے تین چار گارڈز بھی جیپ کے اردگرد موجود تھے۔ انہیں بھی کچھ خاص خبر نہیں تھی کہ یہاں کیا چل رہا ہے، ہاں ان سے اتنا ضرور معلوم ہوا کہ اگر پرنس کے کزن کی جان گئی ہے تو وہاں دوسری طرف شنگرے خاناں کا ایک برادران لاء بھی ہلاک ہو گیا ہے۔

عمران نے کہا تھا کہ وہ بس سن گن لے کر آتا ہے...... مگر پورا ایک گھنٹا گزر گیا۔ وہ واپس نہیں آیا۔ مجھے تشویش ہونے لگی اور اس تشویش کی وجہ سے میں وہ شدید جلن بھی بھول گیا جو میں پیٹ کے متاثرہ حصے پر محسوس کر رہا تھا۔

میں نے سوچا اس کے پیچھے جاتا ہوں اور پرنس سے بھی بات کرتا ہوں مگر اسی اثنا میں عمران مجھے اپنی طرف آتا دکھائی دیا۔ دو گارڈز بھی اس کے عقب میں تھے۔ عمران کا حلیہ دیکھ کر میں تھوڑا سا چونکا۔ اس نے برف پر چلنے والے فل بوٹ پہن لیے تھے۔ موٹے چمڑے کی ایک جیکٹ نما چیز بھی اس کے جسم پر تھی۔ یہ دیکھنے میں بلٹ پروف جیکٹ کی طرح نظر آتی تھی لیکن ایسا نہیں تھا۔ یہ مقامی طور پر تیار کی گئی ایک کوٹی سی تھی۔ اس کوٹی میں کسی درخت کی نہایت سخت چھال بھری جاتی تھی اور لوہے کی باریک پلیٹیں رکھی جاتی تھیں۔ میں نے یہاں انچارج گارڈ اور کچھ دیگر گارڈز کے جسم پر یہ کوٹی دیکھی تھی۔ عمران خلافِ معمول بہت سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔ گارڈز فاصلے پر رک گئے، وہ اندر جیپ میں آ گیا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' میں نے اس سے پوچھا۔

''میں دو دو ہاتھ کرنے جا رہا ہوں یہاں کے سب سے اکھڑ خان بدمعاش سے۔''

''تم عالم خان کی بات کر رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''جی ہاں...... بس آپ مجھے ایک تھپکی دے دیں۔ ابھی دو چار منٹ میں اسے لمبا لٹا کر واپس آ جاؤں گا۔''

''تم اپنے ہوش میں تو ہو؟ تم کیوں لڑو گے اس سے جا کر۔ یہ ہماری لڑائی نہیں ہے۔''

''ہماری لڑائی نہیں تھی لیکن اب کسی حد تک بن گئی ہے۔'' اس نے ٹھوس لہجے میں جواب دیا۔

اگلے دو چار منٹ میں اس نے مجھے جو کچھ بتایا اس نے میرا ٹمپریچر ہائی کر دیا۔ سینے میں آگ سی بھڑکنے لگی۔ عمران نے بتایا کہ لڑائی روکنے کے لیے یہاں محالہ کا فیصلہ ہوا ہے۔ محالہ کے لیے بالاٹ والوں کی طرف سے عالم خان سامنے آیا ہے مگر اس نے ایک شرط رکھی ہے۔ شرط یہ ہے کہ ذخیرے والوں کی طرف سے اسی بندے کو سامنے لایا جائے گا جس نے یہاں آتے ہی اسے زک پہنچائی تھی اور شرمندگی سے دوچار کیا تھا (یہ اشارہ میری طرف تھا) پرنس یہ بات ماننے کو کسی طور تیار نہیں تھا۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ وہ خود عالم خان کے سامنے جانے کو تیار ہے۔ مگر عالم خان اپنی بات پر اڑا رہا۔ جب بات طول پکڑ گئی تو عمران درمیان میں آ گیا۔ اس نے عالم خان تک پیغام پہنچایا کہ تم جس کو بار بار چیلنج کر رہے ہو، میں اس کا بھتیجا ہوں۔ میں تمہارا سامنا کرنے کو تیار ہوں۔ اس پیشکش کے بعد تھوڑی سی بحث تمحیص ہوئی اور بات طے ہو گئی۔

میرا دماغ کھولنے لگا۔ عالم خان کی مکروہ شکل پوری جزئیات کے ساتھ میری نگاہوں کے سامنے گھومنے لگی۔ اس کے ساتھ ہی ذہن میں خطرات کی بہت سی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ مجھے عمران کی دلیری اور فائٹنگ اسپرٹ پر شک نہیں تھا مگر میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ ان معاملوں میں ابھی بہت پختہ کار نہیں ہے۔ دوسری طرف عالم خان کی صلاحیت بھی میں دیکھ چکا تھا۔ وہ ایک نہایت خطرناک اور عیار ''لڑاکا'' تھا۔ (کہا جاتا تھا کہ اس کا باپ بھی بالاٹ کا مانا ہوا جنگجو تھا مگر بعدازاں وہ کسی گھریلو تنازعے کی وجہ سے خود عالم خان

کے ہاتھوں ہی مارا گیا تھا) میرے دل نے گواہی دی کہ اگر جوش کے عالم میں عمران، عالم خان کے سامنے چلا گیا تو خدانخواستہ شدید زخمی ہو کر یا لاش کی صورت میں واپس آئے گا۔

کئی لمحے بڑے کایا پلٹ ہوتے ہیں۔ یہ لمحے انسان کی اصل ہمت طاقت کو بائی پاس کر کے اس کے اندر ایک غیر مرئی توانائی بھر دیتے ہیں۔ میں گاڑی میں سے باہر نکل آیا۔ میں نے اٹل لہجے میں عمران سے کہا۔ ''اگر بات یہاں تک پہنچی ہوئی ہے تو پھر عالم خان کے سامنے تم نہیں جاؤ گے...... میں جاؤں گا۔''

''لیکن چاچو آپ......''

''میں...... اب...... بالکل ٹھیک ہوں عمران۔ پوری طرح فٹ ہوں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

''میں آپ کو نہیں جانے دوں گا۔''

''تم اپنی چونچ بند رکھو۔'' میں نے دانت پیس کر آتشیں لہجہ اپنایا۔ ''تم لڑائی بھڑائی کو مجھ سے زیادہ نہیں جانتے۔ تم اس وقت پالنے میں ہو گے جب سے میں یہ سب کچھ کر رہا ہوں...... اور مجھے یہ بھی پتا ہے، تم عالم خان کے جوڑ کے نہیں ہو۔''

اسی دوران میں پرنس بخت اور انچارج طالب شاہ بھی موقع پر پہنچ گئے۔ وہ اس موڈ میں نظر آرہے تھے کہ محالہ والے آپشن کو ویسے ہی رد کر دیا جائے...... دوبدو مقابلہ کیا جائے پھر جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

میں نے اٹل لہجہ اپنایا۔ ''پرنس! میں جانتا ہوں آپ زبان پر قائم رہنے والی فیملی کے فرد ہیں۔ محالہ کا چیلنج قبول کر کے اس سے پیچھے ہٹنا آپ کو زیب نہیں دیتا...... میں آپ سے پُرزور درخواست کرتا ہوں کہ آپ مجھے جانے دیں، آپ مجھے نہیں جانتے لیکن میں اپنے آپ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اگر آپ میری نہیں مانیں گے تو بھی میں وہی کروں گا جو میں نے سوچ لیا ہے۔''

''لیکن تابش، آپ ابھی......''

''پلیز پرنس بخت اور......'' میں نے اس کی قطع کلامی کی۔ ''میں اب بالکل ٹھیک ہوں...... چاروں خانے فٹ ہوں...... اور اس بندے نے مجھے چیلنج کیا ہے...... اس کا جواب میں ہی دوں گا اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں، دو چار منٹ میں اسے کیچوے کی طرح مسل ڈالوں گا۔ ایسے بہت حشرات دیکھے ہیں میں نے۔''

انچارج طالب شاہ نے ذرا ہچکچاتے ہوئے مداخلت کی۔ ''جناب! وہ بہت خطرناک کلہاڑی باز ہے۔ دوبدو مقابلے میں اس نے شاید ہی کبھی شکست کا منہ دیکھا ہو۔ یہ بات درست ہے کہ یہاں آمد کے موقع پر آپ یکایک اس کے سامنے آگئے تھے اور اسے چند بڑی چوٹیں لگا کر کھڈے میں بھی پھینک دیا تھا لیکن اب وہ پوری تیاری اور طیش کے ساتھ آپ کے سامنے آئے گا......''

''میں بھی یہی چاہتا ہوں...... اس کی حسرت نکل جائے اور غلط فہمی بھی دور ہو جائے۔'' میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

گہرے ہوتے بادلوں اور زور پکڑتی ہوا میں، برف پوش چٹانوں کے عقب میں یہ ایک طویل بحث ثابت ہوئی مگر اس کا نتیجہ وہی نکلا جو میں چاہتا تھا اور جس کا میں فیصلہ کر چکا تھا۔

☆☆☆

بے شک دو دن سے میرے پیٹ کے متاثرہ حصے پر انگارے سے دہکے ہوئے تھے، پورے بدن میں درد کی غیر مرئی لہریں تھیں مگر موجودہ سچویشن میں یہ سب کچھ کسی حد تک پس منظر میں چلا گیا تھا۔ دونوں متحارب گروہوں کے درمیان ایک ہموار سطح پر میں اور جواں سال عالم خان آمنے سامنے کھڑے تھے۔ چوڑے سرخ چہرے اور گھنگریالے بالوں والے عالم خان کی عمر اکیس بائیس سال سے زیادہ نہیں تھی لیکن اپنے ڈیل ڈول اور نقوش کی وجہ سے وہ پختہ عمر نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کسی شکاری درندے کی سی چمک تھی۔ اس کا پسندیدہ ہتھیار چھوٹے دستے کی کلہاڑی اس کے دائیں ہاتھ میں بے تابی سے گردش کر رہی تھی۔ مقامی طرز کی ایک بھاری جیکٹ نے عالم خان کو ڈھانپ رکھا تھا۔ میرے جسم پر بھی درخت کی چھال والی ویسی ہی جیکٹ (کوٹی) تھی جو کچھ دیر پہلے عمران نے اپنے جسم پر چڑھائی تھی۔ ہتھیار کے طور پر میں نے بھی چھوٹی کلہاڑی ہی چن لی تھی۔ میرا ''عقیدہ'' تھا اور ''مہان فائٹر'' بارونداجیکی بھی یہی کہا کرتا تھا کہ میدان میں ہتھیار کی نہیں ہتھیار چلانے والی کی اہمیت ہوتی ہے۔ دونوں طرف کے لوگ محوِ نظارہ تھے۔ وہاں چٹانوں میں کئی خزاں رسیدہ، برف پوش درخت بھی موجود تھے۔ اِکا دُکا تماشائی ان پر بھی چڑھے ہوئے تھے۔ یہ دونوں طرف کے لوگ تھے۔ تماشا دیکھنے کے علاوہ ان کا مقصد یہ بھی تھا کہ ایک دوسرے کی پوزیشنوں پر نظر رکھی جا سکے۔

محالہ کی رسم مختلف ناموں کے ساتھ ان قبیلوں میں مدتوں سے چلی آرہی تھی۔ شروع میں یہ صرف ''مرو یا مارو'' کا مقابلہ ہوتا تھا مگر آج کے دور میں اسے کچھ تبدیل کیا گیا تھا۔ اب قاعدہ یہ تھا کہ اگر دونوں فریقوں میں سے کوئی ہار مان لے یا اتنا زخمی ہوجائے کہ مقابلہ جاری رکھنے کے قابل نہ ہوتو دوسرے کو فاتح قرار دیا جائے گا۔ مقابلے کے خاتمے کی دوسری صورت یہ تھی کہ کوئی ایک فریق اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ مقابلے سے پہلے ایک پنچ نے ہم دونوں کی تلاشی اچھی طرح لی تھی کہ لباس میں کوئی ہتھیار وغیرہ نہ چھپایا گیا ہو۔ میرے کہنے پر دونوں کلہاڑیوں کے پھل بھی چیک کیے گئے تھے۔ مجھے خدشہ تھا کہ عالم کی کلہاڑی پر پھر کوئی زہر وغیرہ نہ لگا ہو۔

میرے سینے میں دھڑکن کسی نقارے کی طرح گونج رہی تھی۔ اپنی جسمانی تکلیف کو یکسر فراموش کر کے میں نے مقابل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دی تھیں۔ وہ نخوت سے دانت نکوس رہا تھا۔ سرسراتی آواز میں بولا۔ ''عالم خان کے ساتھ ٹکر لینے سے پہلے اپنی عمر کا خیال تو کرلیا ہوتا۔''

میں نے کہا۔ ''یہ بکواس تو تم تب کرو جو میں اپنی عمر کے لیے تم سے کوئی رعایت مانگوں۔ تو ایک بزدل دشمن ہے۔ تو نے چھپ کر مجھ پر زہریلا وار کیا۔ اب یہ کھلا میدان ہے۔''

''اس کھلے میدان کے لیے تو بُری طرح پچھتانے والا ہے بڈھے۔'' اس نے سفاک لہجے میں کہا اور ایک چنگھاڑ کے ساتھ مجھ پر پل پڑا۔ اس کی کلہاڑی کا پہلا وار ہی میری کلہاڑی سے اچٹ کر میرے بائیں کندھے پر لگا۔ اس نے پے درپے سات آٹھ وار کیے جن میں سے کچھ میں نے کلہاڑی پر اور کچھ جھکائی دے کر بچائے۔ اس کی پیش قدمی روکنے کے لیے میں نے بھی ایک دو جوابی وار کیے جو اس نے بڑی مہارت اور مضبوطی سے کلہاڑی کے دستے پر روکے۔ غالباً ٹھیک ہی کہا جاتا تھا کہ اپنے باپ کی طرح وہ ماہر کلہاڑی باز ہے۔

گہری ہوتی دھند میں لوہے سے لوہا ٹکرا رہا تھا۔ کسی بھی وقت کچھ ہوسکتا تھا۔ اردگرد سیکڑوں لوگ موجود تھے لیکن ایسی خاموشی تھی جیسے ایک ویرانہ ہو۔ ایک جگہ وہ مجھ سے گتھم گتھا ہوگیا۔ اس نے آہنی گھٹنے کی تین چار ضربیں میرے پیٹ میں لگائیں۔ یہ متاثرہ حصہ تھا جس کے بارے میں میرے سوا اور کوئی نہیں جانتا تھا۔ میرا سفاک مدِمقابل بھی نہیں۔ بہرحال ان ضربوں نے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔ یوں لگا کہ اسکن پھٹ گئی ہے اور گرم خون کی لکیریں میری ٹانگوں کی طرف سفر کررہی ہیں۔ اگر میں اپنے قدموں پر کھڑا تھا تو یہ میری وہ غیر معمولی قوتِ برداشت ہی تھی جسے میں نے برسوں کی ریاضت سے حاصل کیا تھا...... اپنے جسم کو اپنا جسم ہی نہ سمجھنا، اسے سخت ترین اذیتوں سے دوچار کرنا، اور اس کی ہر فریاد کو اس کے اپنے فائدے کے لیے ہی رد کردینا۔ یہی وجہ تھی کہ ایسے کربناک لمحوں میں میری قوتِ برداشت میرے ارادے کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی ہوجاتی تھی۔

میں نے اپنی دگرگوں جسمانی حالت کی پروا کیے بغیر عالم خان پر چند جوابی وار کیے اور اس کی اندھا دھند پیش قدمی کو روک دیا۔ یہ ایک طرح سے جوانی کے اندھے جوش وخروش اور تجربے کا مقابلہ تھا۔ تجربہ...... جو زخمی بھی تھا۔

ہم پکی برف پر لڑ رہے تھے۔ میری نگاہیں میدان کے اس گوشے پر تھیں جہاں قدرے ڈھلوان پر چند دن پرانی پکی برف موجود تھی۔ میری فائٹنگ اسپرٹ مجھے آگاہ کررہی تھی کہ اگر میں مدمقابل کو وہاں تک پہنچانے میں کامیاب ہوگیا تو کچھ فائدہ حاصل کرسکوں گا اور پھر ایسا ہی ہوا۔ میں کلہاڑی کے وار کرتا ہوا اسے آٹھ دس قدم پیچھے لے گیا۔ وہ پختہ برف پر پہنچا...... اور میرا ایک وار بچانے کی کوشش میں پھسل کر اوندھے منہ برف پر گرا۔ اس کے گرنے سے چند سیکنڈ پہلے ہی میرا ایک وار اس کے گھٹنے کو زخمی بھی کرچکا تھا۔ وہ گرا تو پھر میں نے اسے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا۔ سینے اور کندھوں پر کلہاڑی کی تین چار تگڑی ضربیں کھا کر اس نے پاؤں پر کھڑا ہونے کی کوشش کی تو میرے سر کی ایک دھواں دھار ضرب نے اس کی ناک کی ہڈی توڑ دی اور اسے برفیلی ڈھلوان پر لڑھکا دیا۔ کلہاڑی اس کی گرفت سے نکل گئی۔

اردگرد کی خاموشی کو اب ایک قیامت خیز شور نے توڑ دیا تھا۔ ذخیرنے والوں کو اب میری فتح واضح نظر آرہی تھی۔ میں پختہ برف پر پاؤں جماتا ہوا نشیب میں عالم خان کی طرف جارہا تھا، جب اس ''محالہ لڑائی'' کا سب سے بڑا فاؤل کھیلا گیا۔ عالم خان زخمی حالت میں لڑھکتا اور پھسلتا ہوا جس تناور درخت کے تنے تک پہنچا تھا وہاں اوپر بالاٹ والوں کا ایک بندہ بھی موجود تھا۔ میں نے دیکھا درخت کے اوپر سے ایک سیاہ چیز برف کی طرف آئی ہے جیسے کوئی مردہ چگادڑ سخت سردی سے راہی عدم ہوکر زمین پر گری ہو۔

یہ ایک لوڈڈ پسٹل تھا۔ عالم خان نے جھک کر پسٹل

اٹھایا۔ پسٹل پر گرفت مضبوط کرنے اور میری طرف مڑنے کے لیے اسے صرف دو سیکنڈ درکار تھے...... اور قریباً اتنا ہی وقت میرے پاس تھا اس کے سر پر پہنچنے کے لیے۔ میں نے اپنی لہو میں لتھڑی ہوئی ٹانگوں کی پوری قوت استعمال کی۔ اس سے پہلے کہ سیاہ پسٹل کی آتش رنگ گولی میرے جسم میں داخل ہو جاتی، میں نے کلہاڑی کا تیز پھل عالم خان کے سر میں دھنسا دیا۔ پسٹل استعمال کرنے کی حسرت اس کے دل میں رہی۔ وہ ایک کربناک کراہ کے ساتھ برف پر گرا...... نجانے کیوں...... نجانے کیوں...... ان لمحوں میں مجھے لگا جیسے میں نے بے مہار بدمعاش سے اس نامعلوم شخص کا بدلہ بھی لے لیا ہے جسے میں نے کبھی دیکھا نہیں اور جو اس منحوس کا باپ کہلاتا تھا جو اس کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔

میں نے سن رکھا تھا کہ اکثر قبائلی جرگے اور پنچایتیں وغیرہ لڑائی جھگڑے پر ختم ہوتی ہیں۔ یہاں بھی یہی کچھ ہوا۔ محالہ میں اپنی واضح شکست کو تسلیم کرنے کے بجائے بالاٹ والوں نے اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی (جبکہ ان کا دعویٰ یہ تھا کہ فائرنگ کا آغاز پرنس اور اس کے ساتھیوں نے کیا تھا) ایک دفعہ رائفلوں کے منہ کھلے تو پھر کھلتے چلے گئے۔ گولیوں کی بوچھاڑوں میں، میں جھک کر بھاگتا ہوا پرنس اور اس کے قریبی ساتھیوں کی پوزیشن تک پہنچا۔

میری ٹانگیں اور میرے برفانی بوٹ میرے پیٹ کی رگوں سے بہنے والے خون کی وجہ سے لہولہان تھے۔ ”یہ کیا ہوا تابش صاحب؟“ پرنس چلایا۔

”میں ٹھیک ہوں...... عمران کہاں ہے؟“ میں نے اردگرد دیکھتے ہوئے کہا۔

پرنس اور انچارج طالب نے بھی دائیں بائیں دیکھا۔ عمران کہیں نظر نہیں آیا۔

”ابھی تو یہاں تھا۔“ پرنس نے کہا۔

یہی وقت تھا جب اوپر تلے پانچ چھ ساعت شکن دھماکے ہوئے۔ ایک دھماکا تو ہماری پوزیشن کے بالکل پاس ہوا جس میں دو گارڈز مارے گئے اور دو تین زخمی ہوئے۔ بہت سی برف اور پتھروں کے ٹکڑے ہمارے اوپر گرے۔ کم از کم تین دھماکے ہمارے عقب میں کافی فاصلے پر ذخیرے کی آبادی میں ہوئے تھے۔

پرنس نے شعلہ فشاں لہجے میں کہا۔ ”حرامزادوں نے راکٹ چلائے ہیں۔“

ہم نے مڑ کر عقب میں دیکھا۔ یہ راکٹ بلندی سے خاقان ولا پر ہی چلائے گئے تھے۔ کئی جگہ آگ بھڑکی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ جیسا کہ پرنس اور اس کے ساتھیوں کو معلوم تھا کہ بالاٹ والوں کے پاس سات آٹھ راکٹ موجود ہیں۔ ان میں سے ایک راکٹ تو انہوں نے پرسوں فائر کیا تھا اور باقی غالباً آج چلا دیے تھے۔ (انہوں نے اچانک یہ راکٹ کیوں چلائے؟ اس سوال کا جواب ہمیں قریباً بارہ گھنٹے بعد ملا۔ میری اور عالم خان کی لڑائی کے بعد اندھا دھند شروع ہو جانے والی فائرنگ میں ایک گولی سیدھی شنگرے خاناں کے سینے میں لگی تھی اور وہ نیم مردہ ہو گیا تھا) قریباً دس منٹ کی تابڑ توڑ فائرنگ کے بعد یوں لگا جیسے دونوں طرف کا ایمونیشن ختم ہو گیا ہے۔ اب بس اِکا دُکا گولیاں چل رہی تھیں۔ پھر ہم نے دیکھا کہ لکڑی کی ایک سیاہ پالکی عین اس جگہ پر پہنچ گئی جہاں کچھ دیر پہلے میں نے عالم خان سے دو دو ہاتھ کیے تھے۔ سیاہ پالکی میں سے جھکی ہوئی کمر والا ایک بہت بوڑھا شخص برآمد ہوا۔ اس کی لمبی داڑھی جیسے اس کے گھٹنوں کو چھو رہی تھی۔ اس نے بلند آواز میں کچھ کہا جو ہم تک نہیں پہنچی۔ اس آواز میں گہرا کرب شامل تھا۔ پھر اس نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے جیسے فائرنگ روکنے کا کہہ رہا ہو۔ فائرنگ رک گئی۔

خاقان ولا میں دو تین جگہ آگ کی روشنی نظر آ رہی تھی۔ درمیانی فاصلہ دو کلومیٹر کے قریب تھا، اس لیے کچھ اندازہ نہیں تھا کہ وہاں کیا نقصان ہوا ہے۔ پرنس اب فوراً ولا میں پہنچنا چاہ رہا تھا۔ اس کے اشارے پر دو تین جیپیں حرکت میں آ گئیں۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ عمران کہاں ہے؟ ویسے بھی میرے پیٹ کی اسکن سے مسلسل رسنے والے خون کو فوری ٹریٹ منٹ کی ضرورت تھی۔ پرنس کے حکم پر اس کے پرسنل گارڈز نے مجھے سہارا دے کر پرنس کی جیپ میں سوار کرا دیا۔ ہمیں خاقان ولا تک پہنچنے میں تقریباً بیس منٹ لگے۔ یہ بیس منٹ میرے لیے بے حد کٹھن تھے۔ ایک تو تکلیف...... دوسرے عمران کا خیال کہ وہ کہاں گیا ہے۔ یہاں چار پانچ منٹ کے لیے گولیاں بارش کی طرح برسی تھیں، کہیں......

اس سے آگے سوچنے کی مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ خاقان ولا میں سخت ہلچل نظر آئی۔ ایک راکٹ ”ولا“ سے باہر اور تین اندر گرے تھے۔ یہ دیکھ کر میرا دل بیٹھ گیا کہ مہمان خانے کا آدھا حصہ بھی دھڑا دھڑ جل رہا ہے...... ماہین اور زرش جہاں مہمان خانے میں ہی تھیں۔ خاقان ولا کے درجنوں ملازمین برفیلے پانی کی بالٹیاں بھر بھر کر آگ

پڑ ڈال رہے تھے.....مگر یہ سب کچھ بے سود نظر آتا تھا۔
ڈاکٹر عظیم کا اسسٹنٹ نظر آیا تو میں نے اسے پکڑ کر جھنجوڑ دیا۔ ”یہاں دو لڑکیاں تھیں؟ کہاں گئیں؟“
”دو نہیں جی ایک ہی تھی۔ ان محترمہ کو آپ کے ساتھی عمران صاحب نے نکال لیا ہے۔ وہ بے ہوش ہو گئی تھیں۔ ڈاکٹر عظیم انہیں دیکھ رہے ہیں۔“
مجھے ایک ساتھ خوشی اور پریشانی کا شاک لگا تھا۔ خوشی اس بات کی کہ عمران صحیح سلامت یہاں موجود تھا۔ تشویش اس بات کی تھی کہ اسسٹنٹ صرف ایک لڑکی کو نکالے جانے کا کہہ رہا تھا اور اس کو ابھی ٹھیک سے یہ بھی پتا نہیں تھا کہ وہ ایک کون ہے؟ فضا میں جلے ہوئے گوشت کی ہلکی سی بو تھی جو ثابت کرتی تھی کہ یہاں جانی نقصان بھی ہوا ہے۔
اپنی حالت کی پروا کیے بغیر میں اس جانب لپکا جہاں ڈاکٹر عظیم موجود تھا۔ پرنس بخت نے مجھے روکنا چاہا پھر وہ بھی میرے پیچھے آیا۔ نکالی جانے والی کون تھی؟ یہ سوال ہتھوڑے کی طرح دماغ پر برس رہا تھا۔ تب ہم اس مستطیل کمرے میں پہنچے جہاں چند زخمیوں کو رکھا گیا تھا۔ تب پتا چلا کہ نکالے جانے والی ماہین تھی...... ماہین ایک بستر پر نیم دراز تھی۔ ڈاکٹر عظیم اسے انجکشن لگا رہا تھا۔ میری ابتر حالت دیکھ کر ماہین کی آنکھیں کھلی رہ گئیں۔
”عمران کہاں ہے؟“ میں نے بے قراری سے پوچھا۔
”آپ کے پاس تو کھڑا ہوں۔“ دائیں جانب سے آواز آئی۔
میں نے اسے بمشکل پہچانا۔ اس کا چہرہ دھوئیں کی کالک سے سیاہ ہو رہا تھا۔ سر کے بائیں حصے کے بال تیز حرارت کے سبب چرمرہو کر رہ گئے تھے۔ بائیں جانب سے جیکٹ کا کچھ حصہ بھی جلا ہوا تھا۔
میں نے اسے گلے سے لگایا اور پھر خود ہی کراہ اٹھا۔ پیٹ کی جلد ذرا سے دباؤ کے سبب چھل رہی تھی۔ عمران کی آنکھوں میں میرے لیے تشویش ابھری۔
زرش جہاں کے بارے میں پتا چلا کہ آتشزدگی کے وقت وہ مہمان خانے کے بجائے عقبی باغیچے میں موجود تھی۔ وہ خیریت سے رہی تھی۔
ماہین کے بارے میں معلوم ہوا کہ راکٹ دھماکے کے وقت وہ اپنے بیڈ روم میں تھی۔ دھماکے کے سبب دیواروں میں دراڑیں پڑیں اور بیڈ روم کا دروازہ اس طرح پھنس گیا کہ ماہین کی بہت کوشش کے باوجود کھلنے میں نہیں آیا۔ تب مہمان خانے میں آگ تیزی سے پھیلنا شروع ہو گئی تھی اور کسی بھی وقت بیڈ روم تک پہنچ سکتی تھی۔ عمران پہلے تو ماہین کو آوازیں دیتا رہا پھر ایک دھڑا دھڑ جلتی راہداری میں گھس کر بیڈ روم کے دروازے تک پہنچ گیا۔ یہ دروازہ اندر کی طرف کھلتا تھا۔ عمران نے اسے لاتیں رسید کیں پھر کندھے سے ضربیں لگائیں اور اسے کھولنے میں کامیاب رہا۔ دم گھٹنے کے سبب ماہین کی بری حالت تھی۔ عمران اسے سہارا دیتا ہوا باہر لے آیا۔ ماہین کی قوت برداشت کی بھی داد دینا پڑتی تھی، اس کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید سانس گھٹنے سے ہی ختم ہو جاتی۔

☆☆☆

راکٹ گرنے سے حیرت انگیز طور پر خاقان ولا میں زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا۔ ایک عورت جاں بحق ہوئی چند افراد کو معمولی زخم آئے۔ ہاں مالی نقصان کافی زیادہ تھا۔ تین روز تک ہونے والی دو طرفہ فائرنگ میں صرف پرنس کی سائڈ کے کم و بیش تیس افراد جان سے گئے تھے۔ زخمیوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ ظاہر ہے کہ ان میں سے ایک زخمی میں بھی تھا۔ میرے پیٹ کی جلد میں سے خون کا رساؤ بند نہیں ہو رہا تھا۔ ڈاکٹر عظیم نے اگلے 48 گھنٹوں میں شب و روز میری نگہداشت کی۔ وہ اس بات پر بہت خفا بھی تھا کہ میں نے نشانات نمودار ہوتے ساتھ ہی اسے آگاہ کیوں نہیں کیا تھا۔ بہرحال یہ اوپر والے کا کرم اور اس کی بخشی ہوئی میری اضافی قوت برداشت ہی تھی جس نے مجھے مزید سیریس ہونے سے بچا لیا اور تیسرے روز میری طبیعت سنبھلنا شروع ہو گئی۔ پرنس اور دیگر لوگ بھی حیران تھے کہ میں نے ”گورنام“ کی اس دوسری اسٹیج کا مقابلہ بھی کامیابی سے کر لیا ہے۔
ڈاکٹر عظیم اور ڈاکٹر شاہد کو یقین تھا کہ میری بیماری کا یہ مرحلہ چھوت والا نہیں لہٰذا مجھے الگ تھلگ نہیں رکھا گیا تھا۔ عمران ہر وقت میرے اردگرد موجود تھا۔ تیسرے دن میری طبیعت سنبھلی تو میں نے اس کے سر کے آدھے جلے ہوئے بالوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ ”یہ کیا حلیہ بنا رکھا ہے تم نے؟ فی الحال یہ باقی بال بھی کٹوا دو، کارٹون لگ رہے ہو۔“
وہ بولا۔ ”چاچو! آپ اسے ہیئر اسٹائل سمجھ لیں۔ اگر ماضی کے اداکاروں دلیپ کمار اور وحید مراد کے ہیئر اسٹائل مشہور ہو سکتے ہیں تو حال کے ہیرو عمران جونیئر کا ہیئر اسٹائل مشہور کیوں نہیں ہو سکتا۔“
اپنے والد کی طرح بدترین حالات میں بھی اس کی

حسِ مزاح کسی نہ کسی حد تک برقرار رہتی تھی۔ کئی حوالوں سے تو وہ ''کاربن کاپی'' تھا۔ میں نے سنجیدہ ہوتے ہوئے اسے تعریفی نظروں سے دیکھا۔ ''ہاں عمران! کام تو تم نے واقعی ہیرو والا ہی کیا ہے۔ کئی لوگوں نے تمہاری تعریف کی ہے۔ تم بروقت اندر نہ جاتے تو ماہین کا زندہ رہنا مشکوک ہو جاتا۔''

اس نے سرد آہ بھری۔ ''چاچو! اب کیا ہووت، جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ یہ سب کچھ شروع شروع میں ہو جاتا تو شاید...... ماہین کے دل میں میرے لیے کچھ جگہ پیدا ہوتی۔ وہ یوں کھٹاک سے حشام کی منگیتر نہ بن جاتی۔''

''سب کچھ شادی بیاہ ہی تو نہیں ہوتا عمران۔ محبت کے کئی اور رنگ بھی تو ہوتے ہیں۔ کئی اور رشتوں کے حوالے سے بھی تو کسی سے محبت کی جاسکتی ہے اور اگر کوئی اور رشتہ نہ بن پائے تو کسی سے ''دور'' رہ کر بھی تو پیار کیا جاسکتا ہے۔''

''چاچو! جاتا رہا ہوں دور...... اب انڈیا سے آگے کہاں جاؤں۔ آگے پانی ہی پانی ہے آسٹریلیا تک۔''

''اچھا ایک بات بتاؤ مجھے، تم عین وقت پر یہاں ''ولا'' میں کیسے پہنچ گئے۔ تم تو وہاں لڑائی والی جگہ پر تھے؟''

''یہ کیا سوال ہے چاچو! یہاں راکٹ گرے تھے...... بزو کا راکٹ۔ آگ لگ گئی تھی۔ انیکسی میں بھی آگ نظر آرہی تھی۔ میں نے اپنا فرض سمجھا کہ یہاں پہنچوں۔''

''اب تم پھر بکواس کررہے ہو۔ راکٹ بعد میں گرے تھے۔ تم لڑائی والی جگہ سے پہلے نکل آئے تھے۔''

اس نے پھر ٹھنڈی سانس لی اور مزید اول فول بولنے کا ارادہ ترک کر کے بولا۔ ''دراصل چاچو! مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اب خاقان ولا میں کچھ ہونے والا ہے۔ میں ایک جیپ والے کے ساتھ یہاں آگیا۔ اس کو چھٹی حس کہتے ہیں۔''

کسی اور نے چھٹی حس کا لفظ استعمال کیا ہوتا تو میں اسے زیادہ اہمیت نہ دیتا...... کیونکہ یہ لفظ بہت استعمال کیا جاتا ہے لیکن عمران کے سلسلے میں بات مختلف تھی۔ میں نے اب تک بہت دفعہ محسوس کیا تھا کہ وہ واقعی کچھ واقعات کی بو پہلے سے سونگھ لیتا ہے۔ یہ اس کی چند غیر معمولی صلاحیتوں میں سے ایک صلاحیت تھی۔ مجھے پھر وہ واقعہ یاد آگیا جب اندرانا کی رہائش گاہ پر خونخوار کتوں نے جارحیت چھوڑ کر عمران کے گرد دُم ہلانا شروع کر دیا تھا۔

یہی وقت تھا جب میری اور عمران کی گفتگو کو بریک لگ گئے کیونکہ پرنس بخت آور بڑے جوشیلے انداز میں اندر داخل ہوا تھا۔ ''آپ کو مبارک ہو تابش صاحب! بڑے ملک (سرپنچ) نے محالہ کی لڑائی کا فیصلہ ہمارے حق میں دیا ہے۔ ہم فاتح ہیں۔''

''تو کیا...... فشکرے خاناں وغیرہ نے یہ قبول کرلیا ہے؟''

''موت کو آس پاس دیکھ کر بڑوں بڑوں کی اکڑ پانی ہو جاتی ہے۔ فشکرے خاناں شدید زخمی ہے۔ اس کے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ بڑوں نے اسے سمجھایا ہے کہ وہ مزید وبال اپنے اوپر نہ لے اور اپنی شکست کو تسلیم کرلے......''

پرنس نے اس بارے میں مزید تفصیل بھی بتائی۔

میں نے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے پرنس، کہ آپ کی مجرمہ اندرانا بیگم کو آپ کے حوالے کر دیا جائے گا؟''

''اندرانا ہی نہیں وہ غدار حاجن رانی بھی حوالے ہو گی۔ نوروز خان کے علاوہ وہ دونوں بھی قاتل ہیں وردانام کے اور...... شازمینہ کی ابتر حالت کی۔''

یہ ایک خوشی کی خبر تھی مگر شازمینہ کا ذکر ہوا تو میرا اور عمران کا دھیان اس کی طرف چلا گیا۔ اس کی حالت سنبھلنے میں نہیں آرہی تھی۔ وزن تیزی سے کم ہوتا جارہا تھا۔ بس اسے ڈرپس کے ذریعے خوراک پہنچائی جارہی تھی۔ اس کے علاوہ اس بے چاری کے لیے زبردست ''تھریٹ'' بھی موجود تھا۔ اس اطلاع کی تصدیق ہوچکی تھی کہ منتقم المزاج اندرانا نے بہت بھاری معاوضہ دے کر کسی شخص کو شازمینہ کی جان لینے پر مامور کیا ہے اور وہ کوئی ایسا میل یا فی میل ہے جو یہ کام کرسکتا ہے۔ شازمینہ کے اردگرد سیکیورٹی اب بھی ہائی الرٹ تھی۔ ماہین بڑی مشکل سے ایک دو بار ہی اس سے مل پائی تھی۔ اس کے غم زدہ والد اور چند مخصوص افراد کے سوا کوئی اس کے قریب نہیں جاسکتا تھا۔

☆☆☆

برف باری کے طویل ''اسپیل'' کے بعد آج کل سورج نکل رہا تھا۔ دور ماشر بروم اور گیشر بروم کی چوٹیاں چاندی کی طرح دمکتی نظر آتی تھیں۔ (میں جب بھی ''کے ٹو'' کا نام سنتا تھا، میرے ذہن میں آتا تھا کہ کوئی ''کے ون'' بھی تو ہوگی، تبھی تو اسے ''کے ٹو'' کہا جاتا ہے۔ اب یہ پتا چلا تھا کہ اس ماشر بروم کو ''کے ون'' کہا جاتا ہے۔ کچھ اسی قسم کا سوال ہاکی کے معروف کھلاڑی رشید جونیئر کا نام سن کر ذہن میں آیا کرتا تھا۔ آخر کوئی گمنام کھلاڑی رشید یا رشید سینئر بھی تو ہوگا جس کی وجہ سے دوسرے کھلاڑی کو رشید جونیئر کہا گیا۔ شاید اس رشید سینئر کو ہم کبھی نہ جان پائیں گے)

اب اُمید تھی کہ معاہدے کے مطابق عنقریب اندر بیگم اور حاجن رانی کو ذخیرہ بستی پہنچا دیا جائے گا۔ میری حالت کافی بہتر تھی۔ دونوں ڈاکٹر اور خاص طور سے ڈاکٹر عظیم

میرے لیے بہت کوشش کر رہا تھا۔ شازمینہ کے لیے پرنس نے بہت سخت سیکیورٹی برقرار رکھی ہوئی تھی..... مگر اس کی حالت نازک تھی۔ پرنس اور اس کے ساتھی اسے کسی بھی طرح یہاں سے نکال کر کسی شہری اسپتال میں پہنچانے کا سوچ رہے تھے۔ راستوں کی حالت ایسی تھی کہ فی الحال ہیلی کاپٹر کے سوا کوئی حل نظر نہیں آتا تھا مگر ایسے موقعوں پر ہیلی کاپٹر کا انتظام ہو بھی جائے تو اچھے موسم کی ضرورت ہوتی ہے۔

اس روز ڈاکٹر عظیم مجھے دیکھنے کے لیے آیا تو میری سنبھلی ہوئی حالت دیکھ کر خوش ہوا۔ ''تابش صاحب! آپ اس درمیانی عمر میں بھی ماشاء اللہ بہت فٹ ہیں......اور آپ نے ہر طرح اپنی ''فٹ نس'' ثابت کی ہے۔ یہاں پہنچتے ہی آپ نے لوگوں کے ذہنوں میں اپنا جو تصور بنالیا تھا، آپ محالہ والی لڑائی میں اس پر پورا اترے ہیں۔''

''اس تعریف کے لیے میں شکریے کے علاوہ کیا کہہ سکتا ہوں۔''

ڈاکٹر عظیم عینک درست کرتے ہوئے مسکرایا۔ ''کسی وقت تو لگتا ہے کہ آپ شوبز سے نہیں بلکہ مارشل آرٹ سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر ماضی میں آپ کو بہت دلچسپی رہی ہے فائٹنگ آرٹ سے۔''

''یہ ماضی والی بات درست ہے۔'' میں نے موضوع کو لپیٹتے ہوئے کہا (یہاں ابھی تک سب کو یہی پتا تھا کہ ہم کسی بڑی ٹی وی سیریل کے لیے لوکیشنز ڈھونڈتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہیں۔ چند روز پہلے صرف پرنس بخت کو میں نے حقیقت سے آگاہ کرنے کا ارادہ کیا تھا مگر تاحال یہ ارادہ پورا نہیں ہوا تھا)

ڈاکٹر عظیم میرے پیٹ کے متاثرہ حصے کی بینڈیج کرتے ہوئے بولا۔ ''جو کچھ بھی ہے تابش صاحب! آپ نے اتنی بری حالت میں جس طرح اس بپھرے سانڈ جیسے عالم خان کا مقابلہ کیا وہ یہاں کے لوگوں کے لیے بہت یادگار رہے گا۔ ان فیکٹ آپ نے لوگوں کو بہت متاثر کیا ہے۔''

میں نے کہا۔ ''ڈاکٹر عظیم، متاثر تو آپ بھی کر رہے ہیں۔ جس طرح اس دور دراز ایریا میں دن رات لوگوں کی خدمت کر رہے ہیں۔''

وہ انکساری سے مسکرایا۔ میں نے بات جاری رکھی۔ ''ڈاکٹر عظیم! آپ عرصے سے یہاں موجود ہیں۔ اس اندرانا کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''اس سوال کا جواب بڑا واضح ہے جی۔ وہ نفرت اور کینہ پروری میں ہر حد سے گزری ہوئی عورت ہے۔ اس نے پرنس کے رشتے والے معاملے کو اپنی انا کا مسئلہ بنایا...... اور اس بُری طرح بنایا کہ بیٹی کو طلاق دلوا بیٹھی اور پھر اپنی بیٹی کو بھی اپنے خلاف کرلیا۔''

میں نے کہا۔ ''وہ دردانہ بیگم کی جان لے چکی ہے، پھر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہورہا۔''

''بالکل، اب وہ شازمینہ کی جان کے درپے ہے۔ حالانکہ وہ پہلے ہی ایک طرح سے بسترِ مرگ پر ہے۔''

میں بولا۔ ''اس کے پاس پشتنی پیسا ہے...... اور پیسے سے بڑے بڑے لوگوں کا ایمان خریدلیا جاتا ہے...... یہاں تک کہ ڈاکٹر عظیم جیسے لوگوں کا بھی۔''

''جی...... کیا مطلب؟'' ڈاکٹر عظیم کا رنگ اڑ گیا۔

میں نے اطمینان سے کہا۔ ''شازمینہ اس لیے بسترِ مرگ سے اٹھ نہیں پارہی کہ تم اسے اٹھنے نہیں دے رہے ہو ڈاکٹر عظیم۔ تم بس دو چار دن میں ہی اسے راہیِ عدم کرنے والے ہو۔''

ڈاکٹر عظیم کا رنگ ہلدی اور آنکھیں حیرت سے وا تھیں۔ وہ اضطراری طور پر تھوڑا سا پیچھے کو ہٹا۔ میں نے لیٹے لیٹے اس کا گریبان پکڑلیا۔ وہ حواس باختہ ہوگیا، اس نے یکایک زور مارا اور خود کو چھڑانا چاہا۔ اس کی قمیص نیچے تک پھٹ گئی۔ اسی دوران میں عمران اندر داخل ہوا اور ڈاکٹر عظیم کو سر کے بالوں سے پکڑ کر صوفے پر پٹخ دیا۔ ڈاکٹر عظیم کی عینک اچھل کر دور جا گری۔

عمران نے کہا۔ ''تمہیں ڈاکٹر عظیم کہتے ہیں۔ لیکن عظیم تو کیا تم صرف ڈاکٹر بھی نہیں ہو۔''

وہ دم بخود تھا۔

☆☆☆

ہال نما کمرے میں انچارج طالب شاہ کے ہاتھوں مزید تشدد اور ذلت سے بچنے کے لیے ایک گھنٹے کے اندر اندر ڈاکٹر عظیم نے اعتراف کرلیا کہ وہی وہ ''خوش قسمت'' شخص تھا جسے اندرانا جان نے 24 قیراط کا کوئی آدھ کلو سونا اور پانچ لاکھ نقد پہنچائے تھے اور اسے، شازمینہ کو جان سے مارنے کا ٹاسک سونپنے میں کامیاب رہی تھی۔

ڈاکٹر عظیم سے زیادہ بہتر طریقے سے یہ کام اور کون کرسکتا تھا اور وہ کر رہا تھا، اپنی میڈیکیشن سے شازمینہ کو موت کے دہانے پر پہنچا چکا تھا۔

رابن چڑیوں کی آڈیو ریکارڈنگ والی کارکردگی کے بعد یہ ماہین کی ایک اور کامیابی کہی جاسکتی تھی۔ یہ ماہین ہی تھی جس کو ملاقات کے دوران میں شازمینہ نے بتایا تھا کہ

دواؤں کی ڈوز کے بعد اس کی حالت مزید ابتر ہو جاتی ہے۔
پھر ایک ملاقات میں ماہین نے دیکھا کہ ڈاکٹر عظیم نے شازینہ کو انجکشن دینے کے بعد باقی کے ''وائل'' ڈسٹ بن میں پھینکنے کے بجائے اپنی جیکٹ کی جیب میں ڈال لیا۔ ماہین آنکھیں اور کان کھلے رکھنے والی لڑکی تھی۔ اس نے یہ سب کچھ مجھے بتایا۔ میری ہدایت پر عمران نے کل رات ڈاکٹر عظیم کی غیر موجودگی میں اس کے دفتر کی الماریوں کی تلاشی لی اور ایک مقفل دراز میں سے نہایت مہلک انجکشن دریافت کر لیے۔ یوں ایک اور سازش کو فل اسٹاپ لگ گیا۔ عمران اور ماہین والا معاملہ جوں کا توں تھا۔ اتوار کے روز عمران نے جس طرح دروازہ توڑ کر ماہین کو دھواں دھواں مہمان خانے سے نکالا تھا، مجھے لگتا تھا کہ ان دونوں کی بند بات چیت پھر سے شروع ہو جائے گی...... مگر ماہین صرف شکریے اور احسان مندی کے چند الفاظ بول کر ہی رہ گئی تھی۔
عمران دو روز تو سر کے آدھے جلے بالوں کے ساتھ ہی گھومتا رہا اور اسے ہیئر اسٹائل قرار دیتا رہا پھر میرے اصرار پر اس نے باقی بال بھی چھوٹے کرا دیے تھے۔ آتش زدگی والے اس واقعے کے حوالے سے مجھے عمران کی وہ بات بھی یاد آئی جو اس نے شروع میں شوگراں سے روانہ ہوتے وقت کہی تھی۔ کہا تھا کہ وہ ہمارے ساتھ جائے گا کیونکہ اسے لگتا ہے کہ آنے والے دنوں میں ماہین کسی خطرے میں پڑنے والی ہے۔ اب معلوم نہیں کہ یہ بات بھی اس نے یونہی ہانک دی تھی، یا پھر واقعی اس کی چھٹی حس نے کوئی اشارہ وشارہ دے دیا تھا۔

☆☆☆

حالات اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہے تھے...
یوں لگتا تھا کہ واقعات تیزی سے رونما ہو رہے ہیں۔ ایک دن بعد صلح کے معاہدے کے مطابق وردا خانم کی اصل قاتلہ اندرانا بیگم کو پرنس فیملی کے حوالے کیا جانے والا تھا...... مگر رات کو ایک دھماکا خیز خبر آئی اور جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ شنگریے خاناں کی محل نما کوٹھی میں اندرانا بیگم نے خودکشی کر لی تھی۔ اس کے لیے اس نے وہی زہر استعمال کیا تھا جو وردا خانم اور شازینہ کو مارنے کے لیے اس نے نوروز اور حاجن کو مہیا کیا تھا۔ مرنے سے پہلے اندرانا نے ایک خط اپنی ''باغی'' بیٹی کے نام بھی لکھا تھا۔ یہ خط اندرانا کی لاش اور ملازمہ حاجن رانی کے ساتھ ہی خاقان ولا میں پہنچا۔ بعد ازاں یہ خط پرنس کے ذریعے مجھے دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ اندرانا بیگم نے اپنی ٹیڑھی میڑھی لکھائی میں، بیٹی کو جی بھر کر بددعائیں دی تھیں اور لکھا تھا کہ اس نے جو کچھ کیا اس کی بھلائی کے لیے کیا مگر اس نے خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی ماری اور دشمنوں سے بڑھ کر اپنی ماں کی دشمن نکلی۔ آخر میں اس نے لکھا تھا...... زرش، میں تجھے کبھی معاف نہیں کروں گی۔ میرے بعد میری روح بھی قیامت تک تمہیں بددعائیں دیتی رہے گی۔
جس کو وہ بددعائیں دے کر گئی تھی۔ وہ اپنے لیے کچھ اور راستے چن چکی تھی۔ وہ ایک بے مایہ شخص کی قربت اور محبت کا شکار ہو چکی تھی اور وہ شخص خاقان ولا سے کچھ فاصلے پر شانم بستی کے ایک نیم سرد کمرے میں موجود تھا، ہجر کی آگ میں جھلس رہا تھا۔ اس موقع پر میں نے پرنس کو اس بارے میں سب کچھ بتا دیا۔ وہ یہ جان کر حیران رہ گیا کہ وہ فواد جسے وہ عرصہ پہلے اپنی ملازمت سے فارغ کر چکا تھا ایک بار پھر یہاں ذخیرہ میں ہی موجود ہے۔ میں تہیہ کر چکا تھا کہ پرنس کو ساری تفصیل بتا دوں گا، اور وہ بھی جو زرش جہاں نے نہیں بتایا تھا، اس خوف سے کہ فواد کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔
میں نے پرنس کو آگاہ کیا کہ کس طرح اندرانا نے فواد کو مجبور کیا تھا کہ وہ اس کی بیٹی سے تعلق قائم کرے...... اور زرش کے امید سے ہونے کے بعد وہ کس طرح فواد کو ملک سے باہر بھجوانے یا پھر مروانے کا ارادہ رکھتی تھی۔ بعد ازاں جب فواد، زرش کی محبت میں گرفتار ہو گیا تو اندرانا نے جس طرح شانم لڑکیوں اور دیگر ذریعوں سے اسے بہلانے کی کوششیں کیں وہ سب بھی میں نے پرنس پر آشکار کیا۔ پرنس عجب بیزاری اور کوفت کے عالم میں سنتا رہا...... پھر بہت معذرت سے میں نے پرنس بخت کو اپنی اور اپنے دونوں ساتھیوں عمران اور ماہین کی اصلیت سے بھی آگاہ کر دیا۔ اسے بتا دیا کہ ہم کس طرح فواد کی دکھیاری ماں اور غمزدہ بیٹی کی خاطر اسے تلاش کرتے ہوئے یہاں پہنچے ہیں اور کیا مجبوری تھی کہ ہم نے خود کو ٹی وی پروڈکشن سے متعلق ظاہر کیا۔ پرنس کے لیے یہ سب کچھ بھی حیران کن ثابت ہوا۔
پھر ایک روز میں اور عمران فواد سے ملنے شانم بستی پہنچے۔ موسم خوشگوار تھا، آج یہاں گھنگروؤں کی جھنکار تھی اور یقیناً بند کمروں کے اندر نرم گرم معاملات بھی چل رہے ہوں گے۔ غنچہ گھر میں ہی موجود تھی لیکن ہمارے سامنے اس کی بہن ایمل ہی آئی۔ عمران نے میری طرف دیکھا اور زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔ ہم اسٹور نما کمرے تک پہنچے اور یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ لمبے بالوں اور بڑھی ہوئی شیو والا فواد جانماز پر سجدے کی صورت میں گرا ہوا تھا۔ وہ بالکل

بے حرکت تھا، لیکن نہیں...... حرکت اس کی پشت کے خفیف ہچکولوں میں موجود تھی۔ وہ رو رہا تھا...... گڑگڑا رہا تھا، خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگ رہا تھا اور شاید اپنے لیے زندگی بھی مانگ رہا تھا...... زندگی جو اس کے لیے خوبرو شازمینہ کے وصل کا دوسرا نام بن گئی تھی...... اور کھڑکیوں سے باہر سورج چمک رہا تھا۔ درختوں پر اور زمین پر برف کے ہزار ہا ذرے مسکرا رہے تھے۔ کہیں کہیں برفانی راہن چڑیاں اور ووڈ پیکر جھلک دکھا رہے تھے۔ وہ دعا مانگ رہا تھا اور شاید یہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ میں اور عمران خاموشی سے کھڑے اسے دیکھتے رہے۔ پھر جیسے اچانک فواد کو ہماری موجودگی کا احساس ہوا۔ اس نے اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ اٹھا کر ہماری طرف دیکھا اور گڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

میں نے گدّے پر اس کے بالکل قریب بیٹھ کر اس کے استخوانی ہاتھ تھام لیے۔ ہجر کی آگ اس کی بڑی بڑی بادامی آنکھوں میں فروزاں تھی۔ ”کیا مانگ رہے تھے؟“ میں نے محبت سے پوچھا۔

دو تازہ آنسو اس کی خودرو سیاہ داڑھی میں جذب ہوئے...... وہ آزردہ لہجے میں بولا۔ ”زندگی یا...... موت......“

میں نے کہا۔ ”فواد! ہمارے خیال میں یہ قبولیت کی گھڑی ہے۔ اچھی چیز مانگو اور اچھی چیز زندگی ہے۔“

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگا۔ میں ٹھہرے لہجے میں گویا ہوا۔ ”فواد یہاں کوئی ایسا موجود ہے...... جو تمہاری ہی طرح تمہیں یاد کر رہا ہے۔ وہ تمہارے پیچھے لاہور تک جانا چاہتا ہے۔ تم سے کچھ کہنا چاہتا ہے۔ کچھ سننا چاہتا ہے۔“

فواد کے ہونٹ بے ساختہ لرزنے لگے۔ ”آ...... آپ...... زرش کی بات کر رہے ہو؟“ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اس نے اپنے سر کو دائیں بائیں حرکت دی اور پھر آنکھیں بند کر کے سر دیوار سے ٹکا دیا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے...... کہ وہ بھی مجھے یاد کرتی ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ وہ خاقان ولا کی بہو، وہ لاکھوں میں کھیلنے والی۔ اس نے تو بس ایک وقتی سمجھوتا کیا تھا۔ یہ...... یہ غلط ہے۔ آپ مجھے صرف...... تسلی دے رہے ہو۔“

عمران نے کہا۔ ”دیکھو فواد! اس کھڑکی سے باہر سورج چمک رہا ہے۔ جیسے یہ جھوٹ نہیں ہے۔ ایسے ہی یہ بھی جھوٹ نہیں ہے جو ہم تمہیں بتا رہے ہیں۔“

وہ ہچکیوں سے رونے لگا۔

☆☆☆

اندرانا کی آخری رسومات مسلمانوں کی طرح ہی ادا کی گئی تھیں، مگر کئی لوگوں سے یہ پتا چلا تھا کہ وہ دل سے کبھی مسلمان نہیں ہوئی تھی۔ وہ کسی سوریزان کو دیوتا مانتی تھی۔ مزاجاً بھی وہ اپنی بیٹی زرش جہاں سے بہت مختلف تھی۔ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ نفرت کی آگ میں جلتے جلتے اس کا دل آتش کدہ بن چکا تھا۔

خاقان ولا میں شدید علیل شازمینہ کی حالت ایکا ایکی سنبھلنا شروع ہو گئی تھی۔ اب اسے اس کی والدہ وردا خانم کی وفات کی خبر بھی دے دی گئی تھی۔ ڈاکٹر شاہد اس کی ٹریٹ منٹ کر رہا تھا۔ نوروز کی طرح اب ڈاکٹر عظیم سے بھی مال حرام برآمد ہو چکا تھا۔ عظیم کو نوروز اور حاجن رانی ہی کی طرح خاقان ولا میں بند کر دیا گیا تھا۔ پرنس بخت آور فطری طور پر ایک قانون پسند شخص تھا۔ وہ ان تینوں کو خود سزا دینے کے بجائے قانون کے حوالے کرنا چاہتا تھا مگر فی الحال ایسا ممکن نہیں تھا۔ اس کے لیے اسے تھوڑا انتظار کرنا تھا۔ فواد ابھی تک شانم بستی کے اسی گھر میں تھا۔ البتہ ہم نے زرش کو اس کی یہاں موجودگی کے بارے میں بتا دیا تھا اور ان تمام کربناک حالات سے بھی آگاہ کر دیا تھا جن سے وہ محبت کا مارا یہاں گزرتا رہا تھا۔ اندرانا بیگم کا اسے لاہور سے یہاں لانا، اسے شانم لڑکیوں کے ذریعے بہلانے کی کوشش کرنا، پھر اس کی جان لینے کے درپے ہو جانا۔ ہم نے سب اس کے گوش گزار کر دیا۔

زرش فوراً اس سے ملنا چاہتی تھی مگر وہ خاقان ولا کی سابق بہو بھی تھی۔ اسے فی الحال فواد سے ملانا مناسب نہیں تھا۔ زرش کی حسین آنکھوں کے اندر جھانکا تو جا سکتا تھا مگر عورت کی آنکھوں کی گہرائی میں کیا ہوتا ہے اس کا پتا چلانا آسان نہیں ہوتا۔ ابھی ہمیں ٹھیک سے معلوم نہیں تھا کہ اس کے دل میں اگر واقعی فواد کی محبت موجود ہے تو وہ کس نوعیت کی ہے۔ کیا وہ اس سے صرف ملنے کی خواہش مند ہے یا زندگی کا ساتھ چاہتی ہے۔

موسم خوشگوار تھا۔ سورج کے مسلسل چمکنے نے کام دکھایا۔ ایک روز خبر ملی کہ نشیب میں ایک بڑی ایوالانچ بنی ہے۔ لاکھوں ٹن برف پھسل کر مزید نشیب میں گئی ہے اور یوں ایک ایسا راستہ سا بن گیا ہے جو نیچے جانے میں بڑی حد تک معاون ثابت ہو سکتا ہے۔

ایوالانچ والے واقعے کے قریباً چار دن بعد پرنس ہمیں اپنے خاقان ولا سے رخصت کر رہا تھا۔ وہ کئی طرح سے خوش اور مطمئن تھا۔ اس کا جری دشمن ٹھگرے خاناں اپنے ہی اعمال

کی زد میں آکر نہایت کمزور پڑ چکا تھا۔ وہ لمبے عرصے کے لیے بستر پر پڑ گیا تھا۔ درحقیقت شانم لڑکیوں سے شب و روز کی قربت نے اسے اندر سے کھوکھلا کر رکھا تھا۔ لہٰذا گولی کا ایک زخم ہی اس کے لیے وبالِ جان بن گیا تھا۔ اس کا دستِ راست اور سب سے بڑا بدمعاش عالم خان راہیِ عدم ہو چکا تھا۔ پرنس کے لیے اطمینان کی ایک بات یہ بھی تھی کہ شازینہ صحت یاب ہو رہی تھی۔ میں نے اور ماہین نے اسے دیکھا تھا۔ اس کے رخساروں کے گلاب پھر اپنے رنگ پر آ رہے تھے۔ اس نے خاقان ولا میں بسنے کے جو معصوم سپنے اپنے ذہن میں سجائے تھے...... وہ پورے ہونے والے تھے۔ پرنس نے محبت تو زندگی میں ایک ہی بار کی تھی اور وہ لڑکی اب دنیا میں نہیں تھی...... لیکن یوں لگتا تھا کہ شازینہ کے ساتھ وہ ایک اچھی شادی شدہ زندگی گزار سکے گا (زرش کے ساتھ اس کا بچہ نہ ہونے کا سبب بس قدرتی عمل تھا ورنہ پرنس ہر طرح سے ایک صحت منداور توانا مرد تھا)

ہم خاقان ولا اور ذخیرے سے روانہ ہوئے تو فواد اور زرش بھی ہمارے ساتھ تھے۔ روانہ ہونے سے پہلے دونوں نے مدت بعد ایک دوسرے کو دیکھا اور دونوں کے چہروں پر کئی طرح کے رنگ بکھر گئے مگر دونوں نے ایک دوسرے سے کوئی بات نہیں کی۔

ہمارے قافلے میں لکڑی کی دو ڈولیاں بھی شامل تھیں۔ یہ زرش اور ماہین کے لیے منگوائی گئی تھیں۔ تاہم ماہین نے ہمارے ساتھ پیدل چلنے کو ترجیح دی۔ فواد سے کہا گیا کہ وہ دوسری ڈولی استعمال کرلے کیونکہ اس کی پنڈلی کا زخم ابھی پورا مندمل نہیں ہوا تھا مگر فواد نے بھی انکار کر دیا۔ ڈولی واپس کر دی گئی۔ ہمارے قافلے میں دو مقامی کوہ پیما اور پندرہ کے قریب مسلح گارڈز بھی شامل تھے۔ وقتِ رخصت خوبرو زرش جہاں نے مڑ کر بھی پرنس یا خاقان ولا کی طرف نہیں دیکھا۔ درحقیقت پرنس اور زرش کے درمیان کبھی پیار کا تعلق قائم ہوا ہی نہیں تھا۔ بس ایک بوجھل سا رشتہ تھا جسے دونوں کسی نہ کسی طرح نبھاتے رہے تھے۔

اس سفر کی مشکلات کا ذکر کیا جائے تو روداد بہت طویل ہو جائے گی۔ ہم بہت سنبھل سنبھل کر چلتے ہوئے دو روز میں ایسے مقام تک پہنچ پائے جہاں سے گاڑیوں کی سہولت حاصل کی جا سکتی تھی۔ جس ڈرائیور انعام خان کے ساتھ ہم یہاں پہنچے تھے وہ ہمارا انتظار کر کر کے دو ہفتے پہلے واپس جا چکا تھا۔ بہرطور تھوڑی سی کوشش سے ہمیں ایک اچھی حالت کی بیڈفورڈ جیپ ڈرائیور سمیت مل گئی۔ ہم پانچوں اس میں سوار ہو گئے اور اپنے ساتھ آنے والے گارڈز کو الوداع کہا۔ اب ماشر بروم کی خوب صورت بلندیاں اور ان بلندیوں کے سارے اسرار ہمارے عقب میں تھے۔ ہمارا رخ جنوب کی طرف تھا۔ جنوب جہاں کے سرسبز میدانوں اور بہتے دریاؤں سے آگے لاہور واقع تھا۔ لاہور کے پُرہجوم گلیاں کوچے ہمیں اپنی طرف کھینچ رہے تھے۔ میں نے فواد اور زرش کو علیحدہ علیحدہ سمجھا دیا تھا کہ وہ عمران کے بارے میں کسی سے ذکر نہیں کریں گے کہ وہ بھی ہمارے ساتھ تھا۔ یہ پردہ داری اس لیے بہت ضروری تھی کہ شکی مزاج حسام کی وجہ سے ماہین اور حسام کا رشتہ خطرے میں نہ پڑ جائے۔

لمبے سفر کے بعد جب ہم خوب صورت شہر اسلام آباد پہنچے تو عمران ہم سے علیحدہ ہو گیا۔ اب اسے اپنے طور پر لاہور پہنچنا تھا۔

☆☆☆

وقت کا گھوڑا اپنی مخصوص رفتار سے چلتا ہی رہتا ہے۔ کبھی دلکی چال، کبھی تیز گام اور کبھی سرپٹ۔ ہمیں لاہور پہنچے اب پندرہ روز ہو چکے تھے۔ ماہین اپنے گھر جا چکی تھی۔ میں اپنے گھر آ گیا تھا اور عمران اسی گنجان آبادی میں جہاں وہ رہائش رکھے ہوئے تھا۔ زرش میرے گھر میں تھی اور میری ملازمہ کرن اس کی بڑی اچھی طرح دیکھ بھال کر رہی تھی۔ امید سے ہونے کے سبب اسے اچھی دیکھ بھال کی ضرورت بھی تھی۔ فواد اپنے گھر واقع کینال پارک جا چکا تھا۔ اپنی ماں اور بچی نایاب سے اس کی ملاقات کا منظر دیدنی تھا۔ وہ ان دونوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر دیر تک روتا رہا تھا۔

پھر ایک دن میں نے زرش سے وہ بات پوچھ ہی لی جو کئی دنوں سے پوچھنا چاہ رہا تھا۔ کسی تمہید کے بغیر میں نے اس سے سوال کیا۔ ”زرش...... کیا تم فواد سے نکاح کرنا چاہتی ہو؟“

اس نے سر ہلایا، جیسے اسے میرا سوال بالکل بے محل لگا ہو۔ آنکھوں میں نمی بھر کر شکستہ اردو میں بولی۔ ”آپ کا کیا خیال ہے۔ میں سب کچھ چھوڑ کر یہاں آپ کے ساتھ کیوں چلی آئی ہوں؟“

”یہی تو پوچھنا چاہتا ہوں۔“

”میں...... اب اس شخص کے علاوہ کسی اور کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی جو میرے ہونے والے بچے کا باپ ہے...... اگر وہ مجھے قبول کرلے تو میرے لیے بڑی خوش بختی کی بات ہوگی۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”لیکن زرش! ایک بات پر

غور کر لو۔ تم نے ناز و نعم میں زندگی گزاری ہے۔ روپے پیسے میں کھیلی ہو۔ وہ معاش کے لحاظ سے ایک معمولی شخص ہے۔ چھوٹے گھر میں رہتا ہے۔ اس کی ایک بچی بھی ہے۔''

زرش نے پھر مجھے ایسی نظروں سے دیکھا جیسے میرے سوال کو احمقانہ سمجھ رہی ہو، بولی۔ ''میں یہ سب کچھ پہلے بھی جانتی تھی۔ اس نے مجھے اپنی بچی کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ سب کچھ بتایا تھا۔'' پھر اس کی لمبی پلکیں بے ساختہ جھک گئیں۔ عجیب مستحکم لہجے میں بولی۔ ''جس سے پیار ہوتا ہے اس کی ہر چیز سے پیار ہو جاتا ہے۔''

ان لمحوں میں نجانے کیوں میرے دل نے گواہی دی کہ پہاڑوں سے اُترنے والی یہ لڑکی پہاڑوں جیسے مضبوط ارادے کی بات کر رہی ہے۔ مگر اس کے ذہن میں ایک اندیشہ بھی تھا اور وہ یہ کہ کہیں ایسا نہ ہو، وہ اسے قبول کرنے سے انکار کر دے یا اگر قبول کر لے تو بعد میں کوئی طعنہ ان دونوں کے درمیان آ جائے۔ اس حوالے سے میں نے سے تسلی دی۔ میں نے کہا۔ ''زرش! بے شک تم دونوں سے ایک گناہ سرزد ہوا مگر اس گناہ کا اصل بوجھ تو تمہاری والدہ پر ہے۔ تم پر اپنا غیر معمولی اثر و رسوخ استعمال کرتے ہوئے اس نے تمہیں مجبور کر دیا کہ تم اس راہ پر چلو۔ ورنہ خود تمہارے اپنے کردار میں تو کوئی خامی نہ تھی۔ اور پھر یہ بھی ایک بڑی بات ہے کہ تم نے چپ سادھ کر عیش و آرام کی زندگی گزارنے کے بجائے خود پرنس کو اپنی اس ''صورتِ حال'' کے بارے میں بتایا۔ یہ باتیں فواد بھی اچھی طرح سمجھتا ہے۔''

میری باتوں سے زرش کے اندیشوں میں خاطر خواہ کمی واقع ہوئی۔

اگلے ہی روز میں فواد کے پاس جا کر اس سے اور اس کی والدہ سے ملا۔ چند دن میں معاملات طے ہو گئے۔ زرش کی جائز خواہش تھی کہ یہ بندھن جلد باندھا جائے۔ وہ اپنے بچے کو جلد از جلد اس کے باپ کا نام دینا چاہتی تھی۔ ہمارے لاہور آنے کے قریباً تین ہفتے بعد ایک سادہ سی گھریلو تقریب میں خوبرو زرش جہاں اور فواد کا نکاح ہو گیا۔ وہ انوکھی پہاڑن اپنی انوکھی وفا کے ساتھ فواد کی زندگی میں آ گئی۔ اندرانا بیگم کے سان گمان میں بھی نہ ہوگا کہ اس نے جو سازش تیار کی ہے ایک روز اس کا نتیجہ یہ نکلے گا۔ جنوری کی اس خوش رنگ شام کو خوب صورت نایاب کو خوب صورت زرش کی گود میں مچلتے دیکھ کر مجھے یہی لگا کہ وہی اس کی ماں ہے۔ پرنس بخت اور اسکول وین ڈرائیور فواد کی شکلوں میں معمولی مشابہت سے شروع ہونے والی کہانی بالآخر اپنے انجام کو پہنچ گئی تھی۔ زندگی کے پُرپیچ راستوں پر کہانیاں ایسے ہی انوکھے موڑ لیا کرتی ہیں۔

اس تقریب میں کچھ دوسرے لوگوں کے علاوہ ماہین اور حسام بھی شریک ہوئے تھے مگر میرے بلانے کے باوجود عمران نہیں آیا تھا۔ وہ جیسے ہر ایک سے روٹھا ہوا تھا اور مجھے پتا تھا اس کے روٹھنے کی اصل وجہ خاقان ولا والی بات ہے۔ ماہین کی بات اس کی حساس طبع پر بہت بھاری پڑی تھی۔ اب وہ واقعی یہاں سے جانے کی تیاری میں تھا۔ اس رات پہلی بار میں نے عمران کی غیر موجودگی کو بری طرح محسوس کیا۔ فواد کے گھر سے واپس آ کر میں دیر تک بستر پر لیٹا رہا اور اس کے متعلق سوچتا رہا۔ خاقان ولا میں اس نے میری بیماری سے خوف کھائے بغیر جس طرح رات دن میری تیمارداری کی تھی وہ بھلائے جانے والی بات نہیں تھی، پھر عالم خان سے لڑائی میں میری جگہ اس کا خود کو پیش کرنا...... پھر ماہین کو بیڈروم کے پھنسے ہوئے دروازے میں سے نکال کر لانا۔ کئی واقعات نگاہوں میں گھومنے لگے۔ اسی حالت میں مجھ پر غنودگی طاری ہو گئی۔ میں نے تصور کی نگاہوں سے عمران دانش کو اپنے سامنے دیکھا۔ وہی برسوں پہلے والا عمران دانش، وہ آزردہ لہجے میں بول رہا تھا۔ ''یار تابی! میں نے تو بڑے چاؤ اور پیار سے اپنے بیٹے کو تیرے پاس بھیجا تھا۔ میں اپنے بعد اسے تیرا دست و بازو بنانا چاہتا تھا۔ یہ چاہتا تھا کہ اسے دیکھ کر تجھے ایسا ہی لگے جیسے میں آج بھی تیرے کندھے سے کندھا ملائے کھڑا ہوں۔ وہ میری ساری محبتوں اور خوبیوں کے ساتھ تیرے شہر میں تیرے دروازے پر آیا تھا۔ مگر یار! تو نے اس کی قدر نہیں کی۔ اس کے سارے ارادوں اور حوصلوں کو اپنی بے رخی سے توڑ دیا۔ اب وہ تم لوگوں سے مایوس ہو کر واپس جا رہا ہے۔ کبھی نہیں لوٹے گا میری طرح...... دیکھ لینا کبھی نہیں۔''

میں ایک شدید دھچکے کے ساتھ اپنی غنودگی سے باہر آیا۔ میرے یار عمران دانش کا ہیولا اوجھل ہو گیا۔ میرا دل بڑی شدت سے دھڑک رہا تھا۔

وہ رات میرے لیے دکھ بھری تھی۔ اگلی ہی صبح میں نے عمران کو بلا بھیجا۔ شکر تھا کہ وہ آ گیا لیکن جو میں چاہتا تھا وہ نہ ہو سکا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اگر اس کے جانے کی بات کرتا تھا تو صرف اس لیے کہ مجھے اس کی سلامتی عزیز ہے۔ میں نے قریباً سارا دن اسے قائل کرتے ہوئے گزارا کہ وہ فی الحال انڈیا واپسی کا ارادہ ترک کر دے۔ بسیار

کوشش کے باوجود وہ صرف اس حد تک تیار ہوا کہ دو تین ماہ بعد پاکستان واپس آئے گا۔ مگر مجھے اس کے وعدے پر پختہ شک تھا۔ پتا نہیں کیوں میرا دل گواہی دیتا تھا کہ اس کی حساس طبع اسے پھر واپس نہیں آنے دے گی۔ سوچ بچار کرتے کرتے ایک بات میری سمجھ میں آئی۔ مجھے یوں لگا کہ اس تالے کی چابی ماہین کے پاس ہے۔ ماہین کی وجہ سے ہی اس کے دل میں گرہ پڑی ہے۔ وہی یہ گرہ کھول سکتی ہے۔

شام کو جب عمران اپنی عجیب الخلقت موٹر سائیکل پر واپس چلا گیا تو میں نے ماہین کو فون کیا۔ میرے اور ماہین کے درمیان فون پر ہی قریباً آدھ گھنٹا بات ہوئی۔ ہم دونوں نے ایک لائحہ عمل بنایا۔

تیسرے روز میں نے عمران کو فون کیا۔ وہ گھر سے باہر تھا۔ میرے کہنے پر پہنچ گیا۔ میں نے اس سے پوچھا تو اس نے بتایا کہ والد کی قبر پر گیا تھا۔ میری نگاہوں کے سامنے عمران دانش کی قبر گھوم گئی۔ وہی جگہ جہاں وہ ہمتوں اور بے مثال جراتوں کا شہزادہ جنتر کے درختوں کی چھاؤں میں ابدی نیند سو رہا تھا۔

عمران بولا۔ ”چاچو! آپ نے ان کی قبر پر بڑا دل گداز کتبہ لگوایا ہے۔ ”میرا دوست عمران...... جس کے آنسو مسکراتے تھے۔“

میں نے کہا۔ ”سچی بات یہ ہے عمران کہ الفاظ اس کے مرتبے کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔“

عمران نے میری طرف دیکھ کر آہ بھری۔ ”شاید سچ ہی کہتے ہیں، لوگوں کے دلوں میں جگہ بنانے کے لیے پہلے مرنا پڑتا ہے۔“

میں نے عمران کی اس نشتر جیسی بات کو نظرانداز کیا۔ اسی دوران میں ”ڈوربیل“ ہوئی۔ پروگرام کے مطابق ماہین ”اتفاقاً“ آ گئی تھی۔ اس کے آنے کے دو تین منٹ بعد ہی میں باہر چلا گیا۔ بہانہ یہ کیا کہ میں ایک کال کرنا چاہ رہا ہوں اور یہاں سگنل نہیں آ رہے۔ میں ماہین کو عمران سے بات کرنے کا موقع دینا چاہتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد میں نے واپس آ کر ادھ کھلی کھڑکی کی درز سے جھانکا۔ کئی ہفتوں بعد آج ماہین اور عمران بات کر رہے تھے۔ ان کی آوازیں سننے کے لیے میں نے توجہ مرکوز کر دی۔ ماہین کے چہرے پر اور لہجے میں سچائی کی جھلک تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”عمران! مجھے اپنی غلطی ماننے میں بھی ہچکچاہٹ نہیں ہوئی۔ میں تسلیم کرتی ہوں کہ وہاں خاقان ولا میں میرے منہ سے بے ساختہ کچھ سخت باتیں نکل گئیں۔ عمران! میں دل کی گہرائی سے اس کے لیے معافی مانگتی ہوں۔“

”معافی تو مجھے بھی آپ سے مانگنی چاہیے۔ میں اکثر ضرورت سے زیادہ اور غلط بول جاتا ہوں۔“

”لیکن میرے الفاظ آپ کے لیے بڑے سخت تھے عمران۔ میں اس کے لیے ندامت محسوس کرتی ہوں۔ آپ نے...... آپ نے جس طرح......“ ایک دم اس کی آواز بھرّا گئی۔ وہ بات مکمل نہ کر سکی۔ میں سمجھ گیا اور عمران بھی سمجھ گیا کہ وہ خاقان ولا میں آگ لگنے والے واقعے کا ذکر کرنا چاہتی تھی۔ میں نے پہلی بار ماہین کی آنکھوں میں آنسو چمکتے دیکھے۔ عمران حیرت سے اسے تک رہا تھا۔ جیسے یہ جان کر وہ بھی ششدر ہو کہ وہ چنچل رو بھی سکتی ہے۔ ماہین نے عجیب بھیگے لہجے میں کہا۔ ”عمران! میری اور انکل کی شدید خواہش ہے کہ آپ انڈیا نہ جائیں۔ یہاں ہمارے ساتھ رہیں...... پلیز۔“

وہ کچھ دیر گم صم کھڑا رہا۔ ”لیکن ماہین! آپ نے خود ہی تو کہا تھا کہ میری وجہ سے آپ اور حسام کے تعلق پر اثر پڑ سکتا ہے۔“

”یہ میرا معاملہ ہے عمران! میں اسے اچھی طرح ہینڈل کر سکتی ہوں۔ ایسے تعلق اعتماد کی بنیاد پر قائم ہوتے ہیں اور حسام کو مجھ پر اعتماد کرنا پڑے گا...... اور شاید آپ کو یہ سن کر حیرانی ہو کہ میں نے اسے یہ بھی بتا دیا ہے کہ ماشر بروم کے علاقے میں آپ ہمارے ساتھ تھے اور یہ بھی کہ یہ ساتھ کیسے بنا تھا...... میں نے کچھ بھی چھپایا نہیں۔“

عمران واقعی حیران ہوا۔ وہ کافی دلیر نظر آ رہی تھی۔ اس کے اندر کی سچائی اس کے چہرے پر منعکس تھی اور اس کے گال کا ڈمپل چمک رہا تھا۔ وہ عمران کا ہاتھ تھام کر بولی۔ ”عمران! میرا اور آپ کا رشتہ پُرخلوص دوستی کا ہے...... اور یہ قائم رہے گا۔ ہمیشہ قائم رہے گا۔“ ایک لمحہ توقف کر کے اس نے بات مکمل کی۔ ”اپنے رویے پر آپ سے ایک بار پھر...... ویری ویری سوری۔“

”شرمندہ نہ کریں۔“ عمران نے کہا۔ اس کے چہرے پر نرمی اور نیم رضامندی کے آثار دکھائی دینے لگے تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ ایک گہری سوچ بھی تھی۔ شاید سوچ رہا تھا کہ ماہین کے ساتھ ”پُرخلوص دوستی“ نبھا سکے گا یا نہیں؟

❖❖❖❖
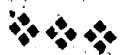
سجاد بھٹی۔ سیف الملوک عباسی۔ یاسر حسنین